آسیہ رزاقی

قسط نمبر 1



جاتے جاڑے کا زمانہ تھا۔ صبح تو نئی چمکتی چمکتی دھوپ سے دن کا آغاز ہوا تھا۔ صبح سے ہی فضا میں حرارت محسوس ہو رہی تھی مگر دوپہر کے بعد ہلکے ہلکے بادل آنا شروع ہو گئے۔ تب بھی کسی کو اندازہ نہ تھا کہ شام کو یہی دور دور بکھرے ہوئے بادل ایک دوسرے سے قریب سمٹ آئیں گے اور جل تھل کر دیں گے۔

سہ پہر کو آندھی آئی اور پھر گرج چمک کے ساتھ بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ موسم جو چند دن سے جلد گرمی آنے کی خبر سنا رہا تھا اچانک چولا بدل کر سرد ہونے لگا۔ ایسے میں بعد دوپہر ٹاؤن شپ سے دو بسیں بدل کر آنے والی رابعہ کو پھوپھی نے روک لیا۔ وہ ان کی سگی بھتیجی نہیں تھی مگر ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آنے والی بھتیجی ان کی سگی بھتیجیوں سے بڑھ کر لگ رہی تھی۔

کچھ دن سے وہ بے حد تنہائی محسوس کرنے لگی تھیں۔ بڑھاپا، کمزوری اور تنہائی کا احساس انہیں رفتہ رفتہ بیمار ڈال رہا تھا۔ وہ اپنی اس بیماری اور تنہائی کا ذکر کس سے کرتیں۔

سعود کو گھر سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ صبح کے گئے رات کو آتے۔ کبھی کبھی دوپہر کو آ بھی جاتے تو اپنے کمرے میں ہی آرام کرتے۔ وہ اپنی ذات سے بھی بے خبر رہتے تھے۔ گو کہ ماں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے اور ان کی اطاعت کو فرض جان کر ادا کرتے مگر پھر بھی مرد تھے اور اپنی زندگی کی چند محرومیوں نے انہیں حد سے زیادہ دل شکستہ کر دیا تھا۔ وہ عموماً خاموش رہتے اور کئی برسوں سے دل میں ناسور پال رہے تھے اور زبان سے اف نہ کرتے اسی لیے ان کی ماں کو اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ ماں باپ کے لیے کیا جذبات رکھتے ہیں۔ وہ ان کی پریشانیوں اور ذہنی و جسمانی خلا کے المیے سے واقف تھیں اور کڑھتی رہتی تھیں مگر کچھ کہنے یا سمجھانے کی ہمت نہ تھی۔ وہ کسی سے بھی اتنے بے تکلف نہ تھے۔ ایک فقط احد کی ذات ایسی تھی جس کے لیے ان کی بے قراری اور شفقت سب پر ظاہر ہو جاتی۔

احد سعود کا بیٹا تھا۔ اس کے آرام اور تربیت کے لیے وہ مضطرب رہتے اور اسی کی محبت نے ان میں کچھ حرارت پیدا کی تھی۔ وہ حوصلے سے مشکلات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اس کے لیے ایک آیا رکھی گئی تھی مگر اب کچھ دن سے پرانی ملازمہ اس کی خدمت پر مامور تھی۔ گو کہ گھر کی دادی کرتی تھیں اور احد کو اپنے پاس سلاتی تھیں۔ سعود چاہتے تھے بچے کے لیے جوان تندرست اور تعلیم یافتہ آیا ہونی چاہیے جو بچے کی نفسیات سے بھی واقف ہو اور عمدگی سے پرورش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

مگر ان کی والدہ آیا کے حق میں نہ تھیں۔ ان کا خیال تھا آیا بچوں پر اپنی ذہنی سطح کے نقوش چھوڑ دیتی ہے اور اپنی ہی نفسیات کے مطابق بچے پالتی ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ جوان، بے اور جواب طلبی کرنے والی ماں نہ ہو۔ آیا کیں بنائی دادی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ صرف بچے کے والدین کو جواب دہ تصور کرتی ہیں اسی لیے سعود اس کے لیے تعلیم یافتہ اور شریف گھرانے کی کسی عورت کی تلاش میں تھے۔

احد کی وجہ سے سعود کی امی کا وقت اچھا گزر رہا تھا مگر اب کچھ دن سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ وہ شدید تنہائی محسوس کرنے لگی تھیں۔ بڑھاپا بذات خود ایک بیماری ہے اور یہ احساس کہ بڑھاپے میں ان کی خدمت اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں، تنہائی دو چند ہو جاتی ہے۔ سعود سے وہ کچھ کہہ نہ پاتیں۔ ان کے پاس اپنی ماں کی تنہائی کا کوئی علاج نہ تھا۔

مسرور اس قدر کھلنڈرا اور مصروف لڑکا تھا کہ اس کا وجود بھی گھر میں کم نظر آتا۔ اس کے کھیل کی وجہ سے ہر طرف اس کی امنگ تھی۔ وہ ہاکی، کرکٹ اور ٹینس کا بہترین کھلاڑی تھا۔ یوں اس نے اپنے ہاتھ پاؤں فٹ بال اور دوڑ میں بھی پھنسا رکھے تھے اس لیے اس کا وقت میدان میں ہی گزرتا تھا یا ٹیموں کے ساتھ دورے پر رہتا۔ گھر آتا بھی تو مہمانوں کی طرح۔ وہ ماں سے زیادہ بھائی کے قریب تھا۔ ڈرتا بھی انہی سے تھا اور ہر بار شہر سے باہر جانے کے لیے اسے بھائی کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ سعود جانتے تھے یہ ان عمر کے تقاضے ہوتے ہیں اور شغل کچھ برا بھی نہیں۔ خود وہ بھی ایک زمانے میں کھیلتے تھے مگر انہیں کھیل سے زیادہ علم حاصل کرنے کی دھن تھی۔ شروع میں بیماری کی وجہ سے وہ سکول میں ترقی نہ کر سکے۔ کلاس میں ہمیشہ کمزور رہے پھر ہم عمر، ہم جماعت لڑکوں کے جملے انہیں ناگوار گزرنے لگے۔

تب انہوں نے ماسٹر حیدر کی شاگردی قبول کی اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ پوری توجہ سے انہیں پڑھا کر کلاس کا بہترین طالب علم بنا دیں گے۔ ماسٹر صاحب نے بھی اپنا وعدہ پورے طور پر نبھایا اور وہ پہلے سال ہی کلاس میں اول آئے۔

تب سے ہی علم کی پیاس اور جستجو انہیں ہر روز شام کو اس راستے پر لے آتی جہاں سے ماسٹر صاحب کے گھر کو راستہ جاتا تھا اور جہاں رابعہ رہتی تھی جس کی معلومات اور تعلیمی قابلیت نے ان کو خاصا مرعوب کر دیا تھا۔ وہ بے حد ذہین اور حاضر جواب تھی۔ سعود سے کافی چھوٹی ہونے کے باوجود انہیں بے وقوف بنایا کرتی۔

پھر کافی سالوں کے بعد سعود نے ماسٹر صاحب کے گھر جانا چھوڑ دیا۔ شاید علم سے جھولی بھر لینے کے بعد اب انہیں ماسٹر صاحب کی ضرورت نہ رہی۔ ماسٹر صاحب تو یوں بھی بے غرض بندے تھے۔ سعود آتے رہے اور وہ انہیں بطور خاص اپنا حاصل کردہ علم گھول کر پلاتے۔ انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔ کبھی کبھی آتے گئے اور بعد میں بالکل ہی ناتا توڑ لیا تب بھی انہوں نے اس بارے میں کسی سے استفسار کرنا مناسب نہ جانا۔ پہلے بھی کب انہوں نے دعوت دی تھی جواب پاتے مگر فکر مند وہ ضرور ہوئے تھے پھر سعود کی مرضی پر راضی برضا ہو گئے۔

وہ والدین کی مرضی سے اپنی علمی کمزوری کو دور کرنے آتے تھے۔ ان کے غریبانہ گھر میں جو لوگ بھی آتے وہ صرف اسی غرض سے آتے تھے اسی لیے رابعہ سب کو خود غرض کہتی تھی۔ غرض پوری ہونے کے بعد کوئی ان کو پوچھتا نہ تھا۔

ماسٹر صاحب سعود کی والدہ کے چچازاد بھائی تھے۔ ٹیچری ان کا مقصد حیات بن گئی تھی۔ ویسے ان کی تعلیمی قابلیت بہت تھی۔ مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر باقاعدہ انہوں نے ریسرچ نہ کی ہو۔ قوم کے نونہالوں کو اپنا مطالعہ، تجربہ اور مکمل علم عطا کرنے کے لیے انہوں نے ٹیچری کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ وہ اسے فرض جان کر ادا کرتے اور کبھی اس سے فائدہ اٹھانے کا نہ سوچا۔ کسی نے فیس دی تو لے لی۔ نہیں تو شکوہ کیا نہ تقاضا۔ گھر والے ان کی اس غنی طبیعت سے شاکی تھے۔ نوجوان نسل کو بامقصد اور اعلیٰ تعلیم کی دولت سے نوازنے والے کے پاس اپنے پیٹ بھرنے کا سرمایہ تک نہ تھا۔ بچا کر رکھتے یا دو وقت پیٹ بھری سے کھانے کا کیا سوال۔ پھر بھی ہمیشہ خدا کے شکر گزار ہوتے۔ بہت ولی صفت تھے ماسٹر صاحب۔

غربت و مشقت کی زندگی، بیماری اور مناسب علاج میسر نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بیوی بہت جلد دنیا کو خیرباد کہہ گئیں اور ماسٹر صاحب اپنی ماں اور بچی کے ساتھ اکیلے رہ گئے۔ رفیق حیات بہت بڑا سہارا تھی۔ اس نے ماسٹر صاحب کو کئی فکروں سے بچایا ہوا تھا یا اس کے رخصت ہونے کے بعد انہیں اندازہ ہوا مگر جلد ہی ان کی بچی نے باپ کی ذمے داری اپنے اوپر لے لی اور وہ بہت آمر حکمراں ثابت ہوئی۔ رابعہ بااصول اور مزاج کی سخت تھی۔

شام کی آمد بھی اور بارش نے موسم کو خاصا رنگین بنا دیا تھا۔ سعود کی والدہ کے نزدیک موسم کی بے حد اہمیت تھی۔ زیادہ گرمی یا زیادہ سردی اعصاب پر بوجھ بن جاتی تھی۔ چند دن سے موسم کچھ گرم ہونے لگا تھا اور ابھی سے انہیں گھبراہٹ ہو رہی تھی لیکن آج کی بارش نے ان کے دل کا بوجھ کافی کم کر دیا تھا۔ وہ کئی دن بعد اتنی مطمئن نظر آ رہی تھیں اور سعود جو تھک ہارے آج دوپہر کو گھر آ گئے تھے اور دوپہر کے بعد پھر شام تک نہیں گئے۔ سوچ رہے تھے کہ میرے دل کا بوجھ آج اتنا ہلکا ہو گیا ہے تو کیا امی کے اوپر بھی کوئی دباؤ تھا وہ بھی مسرور نظر آ رہی ہیں۔ حالانکہ مسرور تو کئی دن سے باہر آیا ہوا تھا۔ اس کی آمد بھی ماں کے لیے خوشی کا سبب بنتی تھی۔ وہ سامنے ہوتا تو وہ خاصی مطمئن اور صحت مند نظر آتی تھیں ورنہ وہ اسی خلش میں مبتلا رہتی تھیں کہ گھوڑے کو کہیں چوٹ نہ لگ گئی ہو۔ موٹی بھاری بھاری گیندیں۔ کبھی انگلی ہلا دیتی ہیں کبھی سر زخمی کر دیتی ہیں۔

''وہ کرکٹ نہیں ہاکی کھیلنے گیا ہے۔'' سعود انہیں بتاتے۔

''تو تو ہاکی کیا کم ہے۔ وہ تو خود ہتھیار ہے۔ جب ہاکی ٹخنے سے آ ٹکرائے، پنڈلی پر نیل پڑتا ہے۔ مخالف کھلاڑی اسے ہتھیار کی طرح چلاتے ہیں۔'' اور اگر وہ کسی دوڑ میں حصہ لینے یا ٹینس کھیلنے گیا ہوتا تب بھی تشویش میں مبتلا ہی اس کا ذکر کرتی رہتیں۔

''اب آئے گا اور پنڈلیوں کے درد سے رات بھر کراہے گا۔ یہ ٹینس جانے کس نے ایجاد کیا ہے۔ یہ تو بندروں کے لیے مناسب تھا کہ اچک ادھر اور اچک ادھر۔ آدمی کے بس کی بات ہے بھلا؟ بس پھر دونوں پنڈلیوں میں درد نہ ہوگا تو کیا ہوگا اور دوڑنے کی بھی بھلا کیا ضرورت ہے جیسے کوئی بلا پیچھا کر رہی ہو اور جان بچا کر بھاگنا پڑے۔ بھلا چین سے گھر بیٹھنے میں کیا تکلیف ہوتی ہے۔''

مگر آج دن بھر انہیں مسرور کا ذکر کرنے یا تشویش میں مبتلا ہونے کی فرصت نہ ملی۔ کمرے میں ہی بیٹھی رابعہ سے باتیں کرتی رہیں۔ شام تک احد بھی انہیں کے پاس رہا۔ البتہ جب وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے تو شکوراں احد کو ان کے پاس سے اٹھا گئی۔ وہ اس سے کھیل رہے تھے تو ان کی امی بھی پاس آ کر بیٹھ گئیں اور سوچتے ہوئے بولیں۔

''سردی بڑھ گئی ہے اور بارش بھی رکنے کا نام نہیں لیتی۔ میں نے رابعہ کو روک لیا ہے۔ کل چلی جائے گی بچی۔ رات کو دو بسیں بدل کر جانے میں دقت ہوگی اسے۔''

''اگر آپ کہیں اور وہ جانا چاہے تو میں گاڑی پر پہنچا دوں انہیں۔'' سعود نے سادگی سے حل پیش کیا۔

''اصل میں احد رفیعہ کے ساتھ بہت خوش رہا۔ رفیعہ نے ایسا سنبھالا اسے کہ میں تو حیران رہ گئی۔'' انہوں نے وضاحت کی۔

''جی۔'' سعود نے دھیرے سے کہا۔

''اور یہ بھی ہے کہ آج نہیں تو کل گرمی آنے کی ہی۔ وہ چھتی پر بڑے بکس میں گرمی کے کافی کپڑے مرمت طلب ہیں۔ سوچ رہی ہوں اتروا کر ان کی مرمت کروا لوں اسی لیے رابعہ کو روکا ہے۔ بہت تیز دست ہے سلائی میں۔''

''شاید انہیں گھر میں کوئی کام ہو۔'' سعود نے دبی زبان سے کہا۔ انہیں اپنے کام کی غرض سے اس کا روکا جانا پسند نہیں آیا اور یہ بات ان کی امی جان ان کے چہرے کے تاثرات سے پہچان گئیں پھر بھی بولیں۔

''اے لو! اسے گھر میں کیا کام ہوگا بھلا۔ محلے کے چار چھ بچے پڑھنے آتے ہیں۔ چھٹی ملے گی تو اور بھی خوش ہوں گے۔ ان کا کون سا گھر والا اور بچے ہیں جو اسے کام کا کوئی فکر ہوگی۔''

''کیوں؟ گھر والے کو کیا ہوا؟ کہیں باہر چلا گیا ہے؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''تم کو تو دنیا کی کچھ خبر ہی نہیں۔'' امی نے تاسف اور شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''خاندان کے بچے بچے کو خبر ہوگی ہے۔''

پھر دبی زبان سے بولیں۔ ''شادی ہی کون سی کیا تھی۔ اس بدنصیب نے تو ماں بہن کی ضد پر شادی کر لی تھی۔ اسے نہ شادی سے غرض تھی نہ عورت کی ضرورت۔ بچی کی زندگی تباہ کر کے جانے کہاں چلا گیا۔ گھر والوں کو کوئی خط۔ چار پانچ دن بعد ڈاک سے طلاق آ گئی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ بیچاری اپنے گھر آ گئی۔ زندگی میں اسی سوتے کا نام لکھا تھا سو پورا ہوا۔ نہ کسی نے دیکھا نہ سنا۔ شادی کا نام ہو گیا۔ دو برس سے گھر بیٹھی بچوں کو پال رہی ہے۔''

سعود کے دماغ میں کسی نے گرم گرم سلاخیں چبھو دی تھیں۔ دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ انگلیوں سے پیشانی اور کنپٹیاں دبانے لگے۔ موسم میں کیسی آگ لپکنے لگی ان کا وجود تپنے لگا۔

امی نے فکرمندی سے کہا۔ ''کیا سر میں درد ہے؟ میں بھی کہوں۔ آج ناوقت کیسے آ گئے اور خلاف معمول گھر میں کیسے نظر آ رہے ہو۔ اے بیٹا! کہہ دیتے تو میں رفیعہ سے کہہ کر تمہارے سر میں تیل ڈلوا دیتی۔ ایسا اچھا تیل ڈال کر دباتی اور سر درد غائب کرتی ہے کہ کیا کہوں۔ کئی دن سے میرے سر میں دھمک ہو رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی پتلی پتلی انگلیوں نے جادو سا کر دیا۔ ٹھہرو! بلاتی ہوں۔''

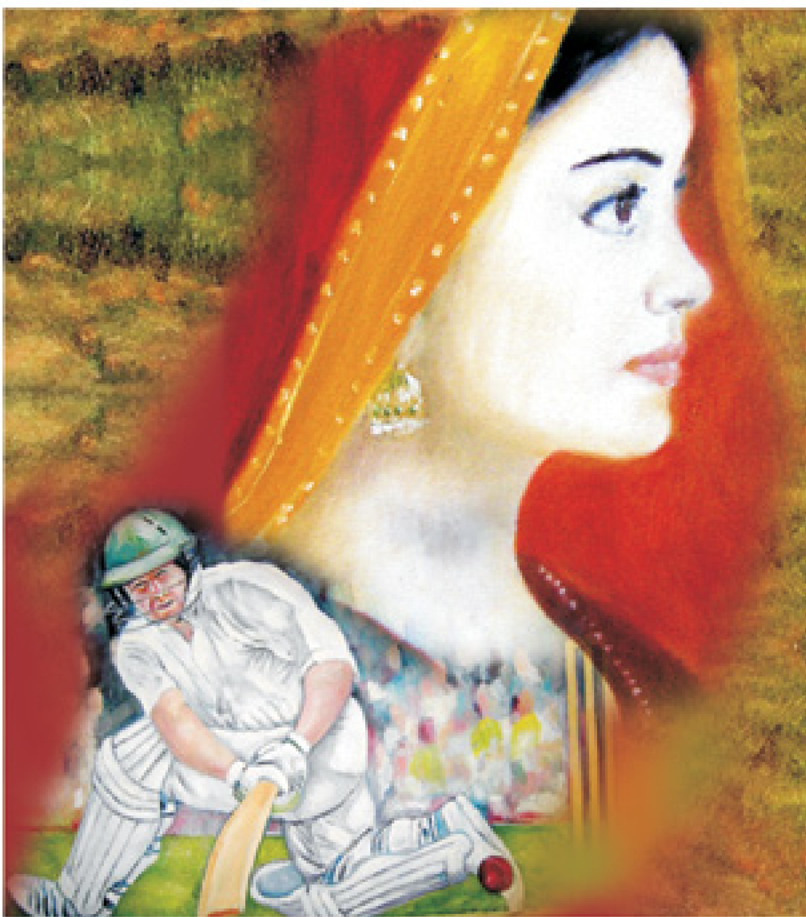
وہ پکارنے لگیں۔ ''نہیں امی! رہنے دیں۔'' وہ کہنا چاہتے تھے یہ درد ایسا نہیں ہے کہ کوئی بھگا سکے۔ یہ بوجھ ہے جو سر سے لگا رہتا ہے۔ سر کے بوجھ سے واقف اور پرواز سے آشنا۔

امی نے ان کے دل کی آواز سنی ہی نہیں اور رفیعہ کو بلا لیا۔ بارہ تیرہ سال کی دبلی پتلی لڑکی گندمی رنگت، سیاہ آنکھیں، سیاہ گھونگھر والے بال۔ ہونٹوں پر مستقل ہی رہنے والی مسکراہٹ جس سے چہرے کے اطراف میں طلوع کا سویرا بکھرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں چمک، تیزی اور ذہانت۔ چہرے پر جستجو کے سائے۔

سعود نے یہ چہرہ پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ آج رفیعہ کو ضرور وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ مگر برسوں پہلے شاید پہلے بھی پہلی بار ہی اس چہرے سے متعارف ہوئے تھے وہ۔ ان کے ذہن میں یہ آنکھیں، یہ ہونٹ، یہ مسکراہٹ روز روشن کی طرح جگمگایا کرتی تھی۔ یہ اجلا تبسم اور سیاہ آنکھوں کی چمک نئی نہیں۔ تیل کی بوتل ہاتھوں میں لیے وہ دو ہی قدموں سے آگے بڑھی۔ نازک نازک انگلیاں ان کے سر میں پیوست ہو گئیں۔ وہ بہت مہارت سے تیل لگا رہی تھی۔ ان کے احساس کو گدگدا رہی تھی۔ تیل لگا کر مساج کرنے لگی۔

''تم بہت اچھا مساج کرتی ہو۔'' انہوں نے اعتراف کیا۔

رفیعہ کی انگلیاں ایک لمحے کو رک گئیں۔ ''جی شکریہ۔''



''میرے سر میں تو درد نہیں تھا مگر بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' سعود نے آنکھیں موند لیں۔ ''تم کو یہ کس نے سکھایا اس قدر مہارت۔''

''آپا کہتی ہیں یہ ہنر قدرتی طور پر مجھے ملا ہے۔ میں نے کسی سے سیکھا نہیں۔ بس ابا اور آپا کے سر کو دبا دبا کر ماہر بن گئی۔'' قدرے شرمیلے پن سے اس نے کہا۔

''مجھے تو نیند آنے لگی۔'' انہوں نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ یہ تبسم کا سرور تھا۔

''آپ لیٹ جائیے پھر اور بھی مزا آئے گا۔''

''ارے نہیں پھر تو میں سچ مچ سو جاؤں گا۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہے تم باتیں کرو تاکہ میری نیند بھاگے۔''

''باتیں.... مجھے تو باتیں کرنا نہیں آتیں۔ آپا کو البتہ بہت اچھی باتیں آتی ہیں۔'' وہ ہتھیلی سے سر تھپکتے ہوئے تعریفی انداز میں بولی۔ ''جب وہ بولتی ہیں نا تو جی چاہتا ہے بس سنے جاؤ مگر اب جب سے ابا گزرے ہیں، وہ ایک دم چپ ہو گئی ہیں اور جب سے شادی ہو کر گھر آئی ہیں، جب سے تو منہ پر تالا ہی لگ گیا ہے۔ جب تک کچھ پوچھا نہ جائے جواب نہیں دیتیں۔ میں بولتی رہوں کچھ نہیں بولیں گی یا پھر پڑھاتے میں آواز سنی جا سکتی ہے۔''

سعود اس کے کرب کا احساس کر سکتے تھے۔ وہ چہکتی چلبلی خاموش ہو گئی اس کی وجہ معمولی نہیں ہو سکتی۔

''تم.... تم پڑھتی ہو؟'' انہوں نے اپنے خیالات سے نجات چاہی۔

''جی! آٹھویں میں پڑھتی ہوں۔ آپا تو کہتی ہیں مجھے ایم اے کرائیں گی مگر میرا دل اتنا بہت سا پڑھنے سے ہی گھبراتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں بی اے بھی بہت کافی ہے یا پھر سائنس پڑھوں اور ڈاکٹر بن جاؤں مگر ڈاکٹری پڑھنے میں تو بہت پیسہ خرچ ہوتا ہے۔''

اس نے ایک طرف جھک کر سعود کے چہرے کو جھانکا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''اور بے چاری آپا کے پاس تو.... اتنا خرچ کہاں سے لائیں گی وہ اگر آپا نے بھی ڈگری لی ہوتی تو بی اے، ایم اے کی تو نوکری کر کے مجھے پڑھا سکتی تھیں۔ سوچتی ہوں آپا کا بوجھ ہی کم ہو جائے، بس بی اے ہی کافی ہے۔''

وہ بول رہی تھی اور اس کے لہجے میں پرانی رابعہ کی ساری جھنکار موجود تھی۔ وہی ترنم، وہی تکلم، وہی احساس۔

''ہاں، ڈاکٹری میں تو بہت خرچ ہوتا ہے۔'' سعود نے اقرار کیا۔ وہ رابعہ کی یاد کو ذہن سے نکال پھینکنے کے لیے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

''مگر مایوس ہونے کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری قسمت اچھی ہو اور کوئی بھرو سہل جائے۔ تمہارے ابا کے ہزاروں شاگرد ہیں جس سے کہو گی وہ تمہیں ڈاکٹری پڑھانے میں مدد دے گا۔''

''جی.... شاگرد....'' وہ چہک کر تلخی سے بولی۔

''رہنے دیں۔ یہ دنیا جو ہے بہت احسان فراموش ہے۔ کتنے ہی شاگرد ہیں ابا کے جو بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔ کوئی ڈاکٹر بن گیا ہے، کوئی انجینئر اور کتنے ہیں جو انہیں یاد رکھتے ہیں۔ ابا نے اپنی زندگی پڑھانے میں گزار دی۔ کوئی نام لیتا ہے ان کا؟ ایک دن ایک صاحب آپا کے سکول تشریف لائے۔ آپا نے ان کو پہچان لیا اور یاد دلایا کہ وہ ابا کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ابا کا نام بتانے پر بھی انہیں خیال نہ آیا۔ الجھتے ہوئے لہجے میں بولے۔ کوئی ایک ماسٹر سے تو پڑھا نہیں ہے میں نے۔ کس کس کو یاد رکھوں، حافظہ بھی خراب ہے میرا تو۔ یہ حال ہے شاگردوں کا۔ ابا کے مرنے کی خبر سن کر آنے والے شاگردوں کی مقدار بس آٹے میں نمک جتنی تھی۔''

سعود کی پیشانی شرمندگی اور خیالات سے سرد ہونے لگی۔ وہ بھی ماسٹر صاحب کے انتقال پر نہیں گئے تھے۔ شاگرد ہوتے ہوئے، رشتہ دار ہوتے ہوئے بھی۔

''تمہاری آپا کس سکول میں پڑھاتی تھیں؟'' بات ٹال کر انہوں نے پوچھا۔

رفیعہ کے ہاتھوں کی حرکت مزید تیز ہو گئی۔ ''سرکاری سکول تھا۔ ابا کی زندگی میں ہی ان کی بیماری کے بعد آپا نے نوکری کر لی تھی۔ ابا کو تو یہ بات پسند نہیں تھی مگر کیا کرتے، کھانے کے لیے بھی گھر میں کچھ نہ تھا اور آپا کہتی تھی کہ میں ابا کو علاج کے بغیر نہیں رہنے دوں گی۔ حق تو ادا کر دیا آپا نے علاج بھی کرایا، مکان بیچ کر۔ ڈاکٹروں کو فیسیں دیں، مگر پھر بھی سب کہتے ہیں موت کا کوئی علاج نہیں۔''

اب وہ نرم و نازک انگلیاں رک رک کر اور زور زور سے بالوں کی جڑوں کو دبا رہی تھیں۔ اس عمل سے انہیں بے حد سکون محسوس ہو رہا تھا۔ سر کا بھاری پن اور کنپٹی کا کھنچاؤ بھی غائب ہو گیا تھا۔

''تم تو بہت ایکسپرٹ ہو بھئی! کاش اب سے پہلے آئی ہوتیں جب میرے سر میں ہر وقت درد رہا کرتا تھا تو میں تم سے سر دبوا کر سکون حاصل کرتا۔ گو کہ اب درد کے اس دورے سے نجات مل گئی ہے مگر اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہارے ہاتھوں میں مسیحائی ضرور ہے۔''

''پہلے آپ کے سر میں بہت درد ہوتا تھا۔''

''ہاں بھئی، ایک زمانے میں تو روزانہ رات کو درد لے کر سوتا تھا اور پھر درد کے اضافے کے ساتھ ہی صبح ہوتی تھی اب تو شکر ہے درد نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی بھاری پن محسوس ہوتا ہے۔''

''تو آپ نے کچھ علاج کیا تھا۔''

''نہیں، لا دوا مرض کا علاج ہی کیا۔''

''بھائی جان سے سر درد بولتے ہوں گے کہ آپ۔''

وہ اب بڑی روانی سے بول رہی تھی اور سعود حیران تھے کہ اس کم عمر لڑکی سے کیوں اس قدر بے تکلفی سے بول رہے ہیں۔ اس لڑکی میں کوئی بات بھی شناسائی کی، اپنائیت کی تھی۔ جیسے وہ نئی نہ ہو۔ وہ اس سے بہت پہلے ملے ہوں۔ اس میں شباہت ضرور تھی۔ وہی انداز، وہی گفتگو کی روانی۔

''جی میری آپا تو خود اتنا اچھا تیل لگاتی اور سر دباتی ہیں کہ ابا تک جو رات بھر نیند نہ آنے کا شکوہ کرتے تھے آپا کے سر دباتے ہی سو جاتے تھے۔ بے خبر ہی۔'' وہ اب ہاتھ کھڑے کر کے سر پر ضربات لگا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اور مسلسل بول رہی تھی۔

''وہ تو آپا کو سکول اور گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی مگر جب بھی وقت ملتا رات کو بارہ ایک بجے بھی وہ ابا کے پاس جا کر سر دباتی تھیں اور جب میرے تیل لگاتی ہیں تو مجھے فوراً نیند آ جاتی ہے۔ چاہے صبح کا وقت ہو۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان سے بھی....'' وہ چپ ہو گئے کیا نامناسب بات وہ کہنے والے تھے۔

''بھابھی جان!'' وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بھابھی جان کہاں گئی ہوئی ہیں؟ چھوٹے منے کو تو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ ساتھ لے جاتیں۔ بچہ تو پھول کی طرح ہوتا ہے ماں کے نہ ہونے سے کملا جاتا ہے جیسے مالی کے بغیر پھول مرجھا جائیں۔''

''ارے۔'' وہ حیرانی سے مڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ ''تم کو یہ بڑی بڑی باتیں کس نے سکھا دیں۔'' بات کا رخ موڑ کر وہ اسی سے سوال کر بیٹھے۔ وہ افسردہ ہو گئی۔

''کسی نے بھی نہیں۔'' اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ ''جب میری امی مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں نا تو لوگ ہمدردی کے لیے آتے تھے اور ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ ابا انہیں منع بھی تو نہیں کر سکتے تھے نا کیونکہ ابا کا خیال تھا کہ کوئی غلط کو غلط کہے تو مت ٹوکو۔ ہاں سچی بات کی نفی کرتا ہو تو اسے منع کر دو گو۔''

''تمہاری آپا بھی نہیں ٹوکتی تھیں؟ وہ تو پہلے ہر بات کو منطقی انداز میں لیا کرتی تھیں۔'' سعود نے سادگی سے سوال کیا۔

''نہیں، آپا بہت ڈر گئی تھیں اور انہوں نے عہد کیا کہ میں اس پھول کو مرجھانے نہیں دوں گی۔ تب سے وہ مجھے اور بھی زیادہ چاہنے لگیں۔''

''تمہاری امی کہاں چلی گئیں؟''

''پتا نہیں، سنا ہے ابا کی غربت سے تنگ آ کر چلی گئیں۔ ابا بیمار بھی رہنے لگے تھے مگر امی کے اس طرح چلے جانے کے بعد وہ بہت جلد مر گئے۔ میری امی بہت خود غرض تھیں۔''

''بری بات۔ اپنی ماں کے بارے میں اس طرح نہیں سوچتے۔''

''میں تو نہیں سوچتی، لوگ کہتے ہیں۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''آپا کہتی ہیں کہ اگر وہ چاہتیں تو ذرا محنت کر کے اور محنت و خدمت سے ابا کو خوش کر دیتیں مگر انہوں نے تو جانے میں بہت جلدی کی۔ ابا کہتے تھے ہر مسئلے کا حل خدمت، محبت اور محنت میں ہے۔''

سعود سوچنے لگے۔ تو میرا اور رابعہ کا دکھ بھی ایک جیسا ہے۔ اس کی سوتیلی ماں رفیعہ کو چھوڑ کر چلی گئی اور میری بیوی احد کو چھوڑ گئی۔

(جاری ہے)

سائبان

آسیہ رزاقی

قسط نمبر 2



سفینہ کے جانے کی ذمہ داری تو شاید میرے رویّے پر تھی مگر رفیعہ کی ماں رابعہ جیسی خدمت گزار، حوصلہ مند اور ہمدرد بیٹی کے ہوتے ہوئے کیوں چلی گئی۔ لوگ اتنے بے صبر کیوں ہوتے ہیں؟ دوسروں کو دکھ اور آزار پہنچا کر انہیں کیا ملتا ہے۔ اس غریب گھر سے جانے کے بعد کتنی دولت مل ہوگی اسے۔ اور سفینہ کو بھی کیا ملا؟ اس نے دوسری شادی اپنی پسند سے کی تو اس کے پہلے بھی تین بچے تھے۔ اپنے بچے کو اپنی خوشیوں پر قربان کر دیا۔ اب وہ دوسرا شوہر اس پر پابندی لگاتا ہے۔ کہتا ہے ایک کو چھوڑ سکتی ہو تو دوسرا چھوڑنا کیا مشکل ہے ہم مردوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ہم تنگ دل ہوتے ہیں اور کمزور پر قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ میں سفینہ سے کہتا تھا۔

''کچھ دن صبر کرو سفینہ! مجھے دم لینے کی مہلت دو شاید میں دل کو سمجھا سکوں اور تم سے ویسی محبت کرنے لگوں جس کی تم متمنی ہو۔''

مگر وہ صبر و برداشت سے عاری عورت مجھ پر اعتماد نہ کر سکی۔ وہ ہر کام فوری اور ہر عمل یک لخت کر گزرنے کی قائل تھی یہی سرشت اسے لے ڈوبی۔ اپنی کسی کمزوری پر قابو پانا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا بہت جلد اس نے میری خطا معاف کر دی اور چلی گئی۔ اف نجات کے بعد کس طرح ہلکا پھلکا ہوگیا تھا میں۔

''اب بس کرو بیٹا! تھک گئی ہوگی تم۔'' انہوں نے اپنے خیالات سے چونک کر کہا۔

رفیعہ کھلکھلا کر ہنسی۔ وہ ان کے کندھے اور گردن سے گرتے ہوئے بال چن رہی تھی۔

''میں نے تو آپ کے کہنے سے پہلے ہی بس کر دیا ہے۔ اب تو میں یہ بال چن رہی ہوں۔ اگر آپ نے اسی طرح لاپروائی سے کام لیا تو عنقریب جناب بالکل گنجے ہو جائیں گے۔ گنج ہائے گراں مایہ نظر آئیں گے۔'' مسعود کو ہنسی آگئی۔ اس لڑکی کے لہجے میں مزاح کا عنصر تھا، فطرت تھا۔

''تمہارا مطلب ہے میں روز مالش کرایا کروں اور تیل میں چپڑے بال لے کر آفس جاؤں اور سب مجھ پر پھبتیاں کسیں، لطیفے بنایا کریں۔''

''توبہ نہیں بس ہفتے میں دو بار مجھ سے تیل دیوا لیا کریں، وہ بھی شام کو۔ پھر صبح سر دھولیں اور عبادت سمجھ کر اس عمل کو جاری رکھیں۔'' رفیعہ نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا حکیمانی جی! آپ کے نسخے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا مگر بڑا افسوس ان ہزاروں لوگوں پر ہو رہا ہے جو بالوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کو تم سا حکیم کیوں نہ ملا۔ جو وہ بے چارے لوگ اس عظیم عبادت سے محروم ہو کر ہمیشہ کے لئے فارغ البال ہو کر رہ گئے۔ ہیں؟''

''بیٹا خنکی میں کیوں بیٹھے ہو؟'' ان کی امی نے کمرے سے پکارا۔ ''اب اندر جاؤ موسم بدل رہا ہو تو احتیاط کرنا چاہیے۔''

واقعی موسم بدل رہا تھا۔ ان کے سنجیدہ اور متفکر چہرے پر کتنے دن کے بعد مسکراہٹ آئی تھی۔ کتنے لمبے عرصے بعد ذہن یوں ہلکا پھلکا ہوا تھا۔ بے رس بے لطف زندگی میں آج برسوں کے بعد موسم کی دلکشی نے رنگ بھرے تھے۔ دوپہر کو وہ محض ایک گھنٹے کے آرام کے لئے آئے تھے۔ جانے کیوں آفس میں اکتاہٹ سی ہوئی اور وہ گھر آ گئے اور آتے ہی ساری تھکن اتر گئی۔

برسوں بعد انہوں نے رابعہ کو دیکھا اور چونک گئے۔ زندگی میں کبھی ملاقات کی امید تو تھی مگر اپنے گھر میں اسے دیکھیں گے، اس کی توقع نہ تھی اور خلاف توقع اسے اپنے گھر میں پا کر وہ بے حد حیران مگر مطمئن سے ہو گئے۔ وہ اب کافی بدل گئی تھی۔ وقت اور بے مہر حالات نے اس کے چہرے سے ہنسی نوچ لی تھی۔ وہ لڑکپن کا تیکھا پن جو چند دن کا جزو تھا عمر کے ساتھ ڈھل گیا۔ وہ ہشاش بشاش مستعد تو عمر کھلنڈری لڑکی ذمے داریوں، محرومیوں اور غموں میں ملفوف باوقار، سنجیدہ اور معاملہ فہم عورت کے روپ میں بھی نظر فریب تھی۔ اتنی ہی دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس نے چولا بدلا تھا مگر وقت نے اسے توڑا نہیں۔ عزم نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔

مگر اب بھی وہ متاثر کرنے میں کامیاب تھی۔ کامیاب ہی نہیں وہ شکست دینے پر بھی قادر تھیں۔ آج بھی وہ برسوں پہلے کی طرح ہار گئے تھے۔ اس نے ان کو دیکھ کر آنچل سر پر ڈال لیا تھا۔ آدھا چہرہ آنچل کی اوٹ میں ہو گیا اور وہ کونے میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ پہلے بھی وہ جب ان سے ناراض ہوتی تھی اسی طرح چہرہ چھپا چھپا کر منہ موڑ لیتی تھی۔ آج بھی وہ خفا ہے یہ جان کر ان کا دل خود بخود مسرت سے بھر گیا۔ وہ خفا تھی اور خفگی دور کی جا سکتی تھی اگر وہ بیزار ہوتی تو۔

وہ جو دلوں کے راز پڑھنے میں طاق ہوتے ہیں جو پردے اٹھا کر جھانکنے میں ماہر ہوتے ہیں وہ صدیوں بعد بھی اس پوشیدہ کیفیت کو سمجھ لینے میں کامیاب رہتے ہیں۔ مسعود بھی رابعہ کے ہمراز تھے اس کے چہرے کے خدوخال سے واقف، اس کی زبان و لہجے کے شناسا اس کی آواز کے زیر و بم سے آشنا۔ اس کی ہر جنبش سے آگاہ، ایک لمحہ بھی نہ لگا انہیں اس کی خفگی اور شکوے کو سمجھنے میں۔

انہوں نے ایک بار ناتا توڑا تو پھر نہ ماسٹر صاحب سے رشتے داری انہیں اس گھر پر لے کر گئی نہ رابعہ کی معصوم محبت نے ان زنجیروں کو پگھلایا جو از خود اپنے پیروں میں وہ پہن چکے تھے۔ وہ زنجیر وہ بندش جس نے ان کے درمیان دوریوں کو وسیع کیا اور مایوسیوں اور دنیا سے بیزاری پر مجبور کیا۔ انہوں نے اس وقت اس بات کو اتنی اہمیت نہ دی تھی۔

مگر آج وقت گزر جانے پر انہیں لڑکپن کی حماقت اور ناتجربہ کاری محسوس ہو رہی تھی۔ پچھتانے کے لئے تو انہوں نے اپنے ماضی کے کتنے دن کتنی راتیں قید کر دیے تھے، اتنے محسوسات کے آئینوں میں اب وہ دور بھی گزر چکا۔ آئینوں کا دھندلا پن بھی زمانے کی ہوا اس نے صاف کر دیا تھا۔ اب وہ غلطیوں اور حماقتوں کے دور سے نکل آئے تھے۔ ہر چہرہ صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔ عمل کیلئے تیار بھی تھے مگر راستے جدا ہو چکے ہوں تو ہم سفر بننا بہت مشکل ہوتا ہے۔

بارش تواتر سے برستی رہتی۔ رات سرد تھی دونوں لڑکیوں کو پھوپھی اماں نے اپنے برابر والے کمرے میں سو جانے کی ہدایت کی تھی اور خود وہ نماز پڑھنے لاؤنج میں چلی گئیں۔ مسعود امی کے کمرے میں احد کے پاس آ کر لیٹ گئے۔ احد ان کی امی کے پاس ہی رہتا تھا۔ شگوراں اسی کمرے میں قالین پر سوتی تھی۔ وہ سو چکی تھی کیونکہ آج باتوں میں امی کو نماز پڑھنے میں دیر ہوگئی تھی۔ اور احد بھی سو چکا تھا۔ روزانہ جب امی عشاء کی نماز کے لئے دوسرے کمرے میں جاتی تھیں، وہ احد کے پاس لیٹ جاتے تھے۔ اس کے ہاتھ پیر سے کھیلتے تھے اور پیار کرکے محبت کی نئی کیفیت سے سرشار ہوتے۔

وہ جاگتا ہوتا تو نیند سے مغلوب ہو جانے تک باپ کی قربت سے خوش ہو کر اٹھکیلیاں کرتا اور شرارت سے ان کی ناک میں انگلیاں ڈال کر یا بال نوچ کر خوشی کی چیخیں مارتا۔ اس کی قلقاریاں سن کر نماز پڑھتی ہوئی مسعود کی امی خدا کا شکر ادا کرنے لگتیں۔

آج احد سو چکا تھا۔ امی کو نماز میں دیر ہوگئی تھی۔ شاید اسی کام میں مصروف ہوں گی جس کے لئے انہوں نے رابعہ کو روکا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں دونوں بہنیں لیٹی تھیں۔ بند کمرے میں بارش کی سرسراہٹ بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ ہر سمت خاموشی تھی۔ وہ احد کے بالوں میں انگلیاں ڈالے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھنے لگے۔ ایک نوجوان ماں بچے کو جھک کر چوم رہی تھی۔ بچہ مسکرا رہا تھا اور ماں کے بال مٹھی میں جکڑے ہوئے تھا۔ ساتھ کے کمرے سے باتوں کی صاف آواز آنے لگی۔

''رفیعہ! میں نے پہلے بھی تم کو سمجھایا ہے نا کہ زیادہ بولنا بیوقوفی کی علامت ہوتا ہے۔''

''جی آپی! سمجھایا تو ہے۔''

''مگر تم نے بھی ہر بار نہ سمجھنے کا مظاہرہ کیا ہے۔''

''کیوں آپا؟''

''آج شام کیا ہو رہا تھا۔ تم اس قدر بک بک کر رہی تھیں کہ میں سن کر شرم سے پانی پانی ہوگئی۔''

''کب؟ کب آپی؟'' رفیعہ کی آواز میں ضد کے ساتھ جھنجھلاہٹ تھی۔

''شام کو برآمدے میں۔''

''شام کو کب؟ اچھا۔۔۔۔ وہ تو میں احد کو کہانی سنا رہی تھی اور کہانی سنانے میں تو بولنا پڑتا ہے نا آپا! خاموشی سے کوئی کیسے کہانی سنائے اور کیسے بچے کو بہلائے۔'' رفیعہ کے پاس دلیل تو تھی مگر وہ بات سمجھ ہی نہ پائی تھی۔

''کہانی کا ذکر ہے اور ویسے بھی وہ بہت چھوٹا ہے۔ کہانی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ البتہ تم کو بک بک کرنے کا موقع مل گیا لیکن میں اس وقت کی بات نہیں کر رہی۔''

رابعہ اب جھلا گئی تھی۔ ''میں شام کی بات کر رہی ہوں جب تم مسعود بھائی سے جانے کہاں کہاں کی اڑا رہی تھیں۔''

''میں۔۔۔۔ میں نے کوئی غلط بات کی آپا۔'' رفیعہ کے لہجے میں ضد تھی، انکار تھا اور جواب کے روپ میں سوال تھا۔ رابعہ کو غصہ آنا لازمی تھا جو اسے پسند نہ تھی۔

''ساری باتیں بالکل بے موقع اور بلا سبب۔ جانتی ہو تمہاری اس عادت سے مجھے کتنی کوفت ہوتی ہے اور میں نے کتنا سمجھا بجھا کر لائی تھی تمہیں؟ پہلی ملاقات میں کیا اتنا فری ہو جانا زیب دیتا ہے کسی لڑکی کو؟ میں کس قدر شرمسار ہو رہی تھی۔''

''تو آپی! پھر آواز دے کر منع کر دیتیں۔ میں چپ ہو جاتی۔'' رفیعہ اب شرمندہ ہوگئی۔

''چاہتی تو یہی تھی میں، مگر دوسروں کے سامنے تمہیں شرمندہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی اس لئے اب سمجھا رہی ہوں۔ بی بی! زبان پر قابو پانا سیکھو۔ یہ زبان کبھی کبھی بہت ذلیل کراتی ہے انسان کو۔ ساری زندگی پچھتاوا اخراج لیتا ہے اور پھر بھی تلافی نہیں ہو پاتی۔''

''معاف کر دیجئے آپا! میری وجہ سے آپ کو کوفت ہوئی۔ آئندہ کسی سے بات نہیں کروں گی۔''

''میں نے بات کرنے سے تو نہیں روکا تمہیں'' رابعہ کی آواز میں آنسوؤں کی گھلاوٹ تھی۔

''مگر ذرا بے موقع گفتگو سے پرہیز کرو تو اچھا ہوگا۔ فائدہ نہیں تو نقصان بھی نہ ہوگا۔''

''آپا!'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد رفیعہ نے آہستہ سے کہا۔ ''مگر ہماری رشتے داری تو ہے نا مسعود بھائی سے پھر بھلا کیا نقصان ہو سکتا ہے۔''

''رشتے داری کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم بلاوجہ پریشان کریں انہیں۔ ہمارے مسائل سے دلچسپی ہو نہ ہو مگر ہم دکھڑے روتے ہیں یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔''

''اچھا آپی! آپ کہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔''

رابعہ میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ ہر بات میں طبقات اور امیری غریبی کے فرق کو بحث میں گھسیٹنا بھول گئی تھی ورنہ رفیعہ سے وہ اسی طرح مخاطب ہو سکتی تھی کہ وہ امیر ہیں، ہم غریب ہیں اور رشتے داری کے باوجود دونوں کے درمیان خلیج حائل ہے وغیرہ۔

مسعود کے ذہن پر برسوں پہلے کی یادیں روشن ہونے لگیں۔ بک بک کرنے والی، بحث میں الجھنے والی اور ہر بار فتح پا کر مسرور ہونے والی وہ تیز مزاج لڑکی جس سے ان کی روز کھٹ پٹ ہوتی اور وہ ہر بار عہد کرتے کہ آئندہ تمہارے گھر نہیں آؤں گا اور ہر بار وہ تیکھے انداز میں کہتی۔

''آؤ گے دس دفعہ آؤ گے۔ اپنی غرض کے لئے آؤ گے پڑھنے کے لئے آؤ گے نہیں تو فیل نہ ہو جاؤ گے مجھے کیا لینا ہے تم سے۔''

''میں ماموں سے شکایت کروں گا چڑیل ہوگی۔''

''کرو۔ میں ان کی ڈانٹ سے ڈرتی ہی نہیں۔ وہ تو پیار سے سمجھاتے ہیں، مارتے نہیں ہیں۔ اگر مارنے کی عادت ہوتی نا تو تم سب سے زیادہ پٹا کرتے۔'' وہ جھینپ جاتے۔ کلاس میں بہت کمزور تھے اسی لئے ماموں انہیں بطور خاص زیادہ توجہ سے اور دیر تک پڑھاتے تھے مگر رابعہ ہر روز لڑائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ ہر شام ان کے قدم ماسٹر صاحب کے گھر کی سمت انہیں کھینچے لے جاتے اور ہر روز سہ پہر سے ہی رابعہ کی آنکھیں دروازے کی جانب نگراں ہوتیں اور کان ان کی مخصوص چاپ کے منتظر۔

چودہ پندرہ سال کی اس لڑکی میں خدا نے بے شمار صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ کچھ عرصے بعد ہی گھر کی ذمہ داری سنبھالنے کی اہل ہو چکی تھی۔ ماسٹر ایک لحاظ سے مطمئن تھے کہ انہیں قدرت نے ایک ایسا دستِ راست عطا کیا تھا جو کبھی کسی موقع پر ان کو مایوس نہیں کرتا۔ شروع میں لوگ انہیں دوسری شادی پر اکساتے رہے ان کی ماں بھی چاہتی تھی کہ وہ پھر سے گھر بسا لیں مگر انہیں پڑھنے پڑھانے سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اس بارے میں سوچتے۔

جب تک ان کی والدہ زندہ رہیں، وہ گھر کی ذمہ داریوں اور فکروں سے بچے رہے، ان کے انتقال کے بعد بہت پریشان رہے۔ ان کی والدہ کی زندگی تک عزیز رشتے داران سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بھی پورے خاندان میں مقبول تھیں۔ اپنی بزرگی اور تجربے کی بدولت سب کے کام آتی تھیں مگر ان کے بعد رشتے داروں نے بھی انہیں فراموش کر دیا۔ مسعود اور ان جیسے چند خاندان کے لڑکے تھے جس سے کچھ رابطہ تھا۔ بقول رابعہ کے وہ بھی سب مطلب کے لئے رابطہ تھا۔ لڑکے پڑھنے آتے تھے تو لامحالہ شرماحضوری کبھی کبھی ماں باپ بھی آ کر جھانک جاتے۔

مسعود بچپن سے ہی ماسٹر صاحب کی قابلیت سے مرعوب تھے۔ کچھ تو ماں کا بیان اور پھر ان کے پرانے گھر کے ٹوٹی ہوئی اینٹوں والے فرش کے کمروں میں کتابوں کے انبار انہیں متاثر کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب علم کے دیوانے تھے۔ قانون، میڈیکل اور حساب و جغرافیہ ہر مضمون کی موٹی موٹی کتابیں ان کے مطالعے میں رہتیں۔ جستجوئے علم انہیں زمانے کی دوڑ میں پیچھے چھوڑ گیا۔ شہر کے تمام سکولوں میں ان کا سکول ہمیشہ نتائج کے لحاظ سے بازی لے جاتا تھا۔ وہ اپنا حاصل کردہ علم شاگردوں میں منتقل کرنے میں ذرا بخل سے کام نہ لیتے۔

دور دور سے طلباء ان کے گھر آ کر سبق لیتے۔ وہ سب سے فیس بھی نہیں لیتے تھے۔ صرف ان سے جو دینے کے قابل ہوں اور جب وہ پڑھا رہے ہوں تو کوئی بھی آ کر اس محفل میں شریک ہو جائے، انہیں پیسے کی پروا تھی نہ شہرت کی تمنا۔ مگر شہرت رہی تھی اور پیسہ کم ہو رہا تھا۔ ان کی عادت سے واقف ہو کر لوگ اپنی جیبوں کی حفاظت کرنے لگے۔ جب مفت میں بچے پڑھ سکتے ہیں تو کیوں خرچ کیا جائے مگر ان میں ایسے بھی لوگوں کی کمی نہ تھی جو بغیر مانگے فیس ادا کرتے تھے۔ مسعود کے والد ہمیشہ ڈاک سے منی آرڈر بھیجا کرتے تھے۔ وہ ماسٹر صاحب کی شریف النفسی اور ضرورت سے واقف تھے۔ مسعود سب لڑکوں کے جانے کے بعد بھی پڑھتا رہتا اور رابعہ سے گپ شپ بھی کرتا۔ ماسٹر صاحب گفتگو کے ذریعے بھی اپنے تجربے، مشاہدے اس کی نذر کرتے رہتے جس سے علم میں اضافہ ہوتا۔ مسعود کو بھی ہر قسم کا تجسس رہتا اور وہ کرید کرید کر ہر بات ذہن نشین کر لیتے۔

اسی وجہ سے رابعہ کو انہوں نے متاثر کیا تھا۔ گو کہ زبان سے وہ یہی کہتی۔

''سب چلے جاتے ہیں اور تم رہ جاتے ہو۔ ابا کو آرام کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ آخر اتنا پڑھ کر کرو گے کیا؟''

''تیل نہیں بیچوں گا۔'' مسعود کہتے۔

ان کے والد جب مسعود سے خفا ہوتے تو ان کی ماں سے کہتے تھے کہ تمہارا بیٹا پڑھنے لکھنے میں پھسڈی ہے۔ وہ تو تیل بیچے گا یا گھاس کھودے گا دیکھ لینا۔

''تیل نہیں بیچو گے تو پھر اور کیا کرو گے؟''

''افسری کروں گا۔''

''ہونہہ! افسری'' وہ تیکھے انداز میں کہتی۔ ''استاد کو افسری نصیب نہیں، شاگرد کو خواب آنے لگے افسری کے۔ رہو گے تو وہی ماسٹر حمید کے شاگرد۔''

''تو اس میں کیا شک ہے مجھے فخر ہے میں نے ماموں سے پڑھا ہے بلکہ بہت کچھ سیکھا بھی ہے اور پڑھنے سے زیادہ سیکھنے کی قدر ہوگی اسی کو کام میں لاؤں گا۔''

''بہت اچھی بات کی بیٹے'' ماسٹر صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ ''پڑھ کر سیکھنا اور اسے کام میں لانا ہی ترقی کی بنیاد ہوتا ہے۔ بہت قابل ہو گے مجھے یقین ہے۔''

''ہاں اور قابل بن کر بھول جائیں گے کہ کس کی بدولت ملی یہ قابلیت اور افسری''

''کیوں بھولوں گا کیوں؟''

''اس لئے کہ تمہارے طبقے کا یہی اصول ہے''

''پھر طبقے کو بیچ میں لائیں تم'' وہ بھڑک جاتے

''یہ احساس کمتری ہے اور کچھ نہیں۔''

''احساس کمتری نہیں، احساس محرومی کہو۔ طبقات کا یہ فرق، احساس کا فرق۔ ایک خاندان، ایک کنبہ ہو کر بھی ایک دوسرے سے ناواقف۔ کوئی اس فرق کو مٹاتا بھی نہیں۔''

''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کسی ایک کے پاس دولت ہے، دوسرے کے پاس نہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خاندان ایک ہے، لہو کا رنگ ایک ہے اور مہک بھی ایک ہے اور یہی رنگ اور مہک رشتوں کی پہچان ہے تو دولت کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑا۔''

''بہت کچھ'' رابعہ ضدی لہجے میں کہتی۔ ''انسان دولت پا کر کانوں اور آنکھوں کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ درد کی آواز سننے کی اسے مہلت نہیں کہ وہ جھنکار سننے کا عادی ہو جاتا ہے، پیسے کی جھنکار۔''

''تمہارا خیال ہے'' مسعود اکتا کر کہتا۔ ''میرا یہ خیال نہیں۔''

''جب افسری کرو گے تو پھر پوچھوں گی مگر میں کیسے پوچھوں گی، تم تو ادھر کا راستہ ہی بھول جاؤ گے اور میں بے غیرت بن کر تمہارے گھر کیوں آؤں گی۔ تم سمجھو گے، آ گئے غریب رشتے دار کچھ مانگنے۔''

''اگر غریب رشتے دار غرض مند ہوں اور امیر ان کی غرض پوری کر سکتے ہوں تو اس میں بے غیرتی کی نہیں، اپنائیت کی خوشبو ہوگی۔ آپس میں غیرت یا غیریت سے نہیں، محبت اور مصلحت سے کام لیا جاتا ہے۔''

''مصلحت، ہونہہ! مجھے تو اس لفظ سے نفرت ہے۔ جی چاہتا ہے یہ لفظ زبان سے خارج کر دوں۔'' وہ تلملا کر دانت پیستی مسعود کو ہنسی آ جاتی۔

''ہاں ہنسو۔ ہم اس قابل ہیں کہ تم لوگ ہماری ہنسی اڑاؤ مگر یہ بات طے ہے کہ یہ لفظ مصلحت تمہارے طبقے میں ہی کام آتا ہے۔''

وہ منہ پر آنچل ڈال کر آنگن کے کونے میں جا کر کسی ایسے کام میں مصروف ہو جاتی جو اسے پہلے نظر ہی نہیں آیا تھا۔ مسعود اسے منانے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ وہ کب اور کس موقع پر خفا ہو جاتی ہے۔ اس کے خفا ہونے سے وہ بے چین ہو جاتے۔

''اماں کے مرنے کے بعد میں نے بہت دکھ سہے ہیں۔'' ایک روز وہ موڈ میں آ کر انہیں بتانے لگی۔ ''تم میری بات کا برا نہ مانا کرو۔ میری زبان تلخ ہے مگر اس کی بھی وجہ ہے۔ اب دیکھو، دادی کے مرنے کے بعد رشتے داروں نے ہمیں بالکل بھلا دیا۔ کوئی سال میں بھی صورت نہیں دکھاتا۔ لوگ شادیوں میں بھی ابا کو نہیں بلاتے، اس لئے نا کہ وہ غریب ہیں، ماسٹر ہیں۔ ابا پر تو کسی بات کا اثر نہیں ہوتا مگر مجھے قلق ہوتا ہے۔ جب خون ایک، اس کا رنگ ایک اور مہک بھی ایک ہی تو یہ کیسی تقسیم ہے کہ چچا مستقیم ہر گھر میں بطور خاص بلائے جائیں اور ابا کو فراموش کر دیا جائے۔ اسی بے انصافی پر میری زبان کھلتی ہے۔ خاموشی تو جرم سمجھتی ہوں میں سچائی کے معاملے میں، بس تم سے بک بک کرکے اور لڑ جھگڑ کر چین آ جاتا ہے جیسے تم سے اس ناانصافی کا بدلہ لے کر سرخرو ہو جاتی ہوں۔''

''تو تم مجھ سے ہی بدلہ لے کر کیوں سرخرو ہوتی ہو۔ ماموں مستقیم کے دونوں صاحبزادے بھی تو آتے ہیں، ان سے کیوں بات نہیں کرتیں۔''

''باپ رے باپ'' وہ زور سے ہنسی اور اس کی ہنسی نے اس کے سارے وجود کو بدل ڈالا۔ وہ رنجیدہ اور سنجیدہ روپ میں ڈوبی لڑکی اچانک بے ساختہ ہنسی سے گلاب کی طرح کھل گئی، مہکنے لگی۔

''وہ چچا مستقیم کی بیگم کو دیکھا ہے۔ اگر میں ان کے بیٹوں سے مخاطب ہو جاؤں اور انہیں بھنک مل جائے تو وہ تو ان بے چاروں کی ٹانگیں ہی توڑ ڈالیں اور کہیں کہ کم تو آگ لگے ایسی تعلیم کو۔ خبردار جو اس لڑکی سے بات بھی کی، مار پھینک دوں گی۔ ارے وہ لڑکی تو حرافہ ہے حرافہ۔'' اس نے ماموں مستقیم کی بیوی کی نقل اتاری تو مسعود کو ہنسی آ گئی۔

(جاری ہے)

آسیہ رزاقی

قسط نمبر 3

سائبان

وہ بہت اچھی نقال تھی۔ مستقیم کی بیگم کو ہر نوجوان لڑکی اپنے بیٹوں پر منتظر نظر آتی تھی۔ وہ تو باپ کی زبردستی سے ماسٹر صاحب کے گھر پڑھنے آتے تھے۔ مفت کا ماسٹر انہیں کہاں ملتا۔ ان کی بیوی نے تو لڑکوں کے داخلے جوان لڑکیوں کے گھر میں بند کیے ہوئے تھے۔ ان کے بیٹوں کی آبرو خطرے میں نظر آتی تھی انہیں۔

لڑکے آتے پڑھنے کیلئے مگر نظریں ادھر ادھر گھماتے تو رابعہ بھی شرارت سے انہیں گھورتی۔ وہ نروس ہو جاتے۔ الفاظ ان کی زبان پر اٹکنے لگتے، سبق ذہن سے نکل جاتا مگر ہر روز کی اماں کی باز پرس نے انہیں خاصی عقل سکھا دی تھی۔ وہ قسم کھا کر کہتے۔

"کون؟ چچا حیدر کی بیٹی؟ نہیں اماں! وہ تو شاید پردہ کرنے لگی ہے۔ ہم نے تو اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔"

سعود، رابعہ کو اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود پسند کرتے تھے۔ بچپن سے جوانی کا سفر انہوں نے حیدر ماموں کے گھر کے آنگن میں طے کیا تھا تو رابعہ کا ساتھ رہا تھا اور اس کی خلط مزاجی، صاف دلی، سچائی کو بھی قبول کر چکے تھے۔ اپنی پسند کا اظہار زبان سے بھی نہ کر سکے، ڈرتے تھے۔ وہ طبقات کے فرق، امیری غریبی کی خلیج کے فاصلے ناپنے گی تو خواہ مخواہ شرمندگی ہوگی۔ وہ اپنی افتاد طبع کی وجہ سے مرعوب تو ہوتی ہی نہیں تھی، محرومیوں کی ستائی ہوئی تنگیوں کی خوگر ہو چکی تھی۔

مانا کہ ان کے گھر پیسے کی فراوانی تھی مگر ماسٹر صاحب کی محنت کی کمائی شب و روز کی بے آرامی کی بدولت وہ اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کے لئے خاصا کما لیتے تھے۔ مسائل سے گھبراتے الجھے ہوئے بھی نہیں تھے کہ انہیں سلجھایا ہی نہ جا سکے۔

رشتے داروں کے دماغ عرش معلی پر پہنچ گئے تھے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جو جیسا ہے، جہاں ہے، وہ رہے گا۔ وہ رابعہ کو اتنا سا نکتہ سمجھانے میں ناکام رہتے تھے۔

وہ ماں کی محبت کی ترسی ہوئی تھی مگر باپ کی شفقت اور سائبان تو میسر تھا۔ صورت شکل میں ہزاروں سے بہتر تھی۔ گھر، باپ کے سائے میں وہ کراچی تعلیم حاصل کر چکی تھی جتنی برسوں میں کالج کے چکر لگا کر اور بسوں میں دھکے کھا کر یونیورسٹی سے لڑکیاں حاصل کرتی ہیں پھر بھی وہ اپنی کڑوی زبان سے مجبور رہتی۔

کسی دن سعود کو پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو وہ دروازے کے کئی چکر لگاتی پھر انہیں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتی مگر زبان سے کہتی۔

"آ گئے، میں تو سمجھی تھی آج پڑھائی کی چھٹی۔ کسی کے ساتھ فلم یا پکنک کا پروگرام بن گیا ہوگا۔ وہ سنا ہے تمہاری لندن والی کزن بھی تو ان دنوں آئی ہوئی ہے اور سیروں میں مصروف ہے۔"

یا پھر کہتی۔ "ابا کوئی فالتو تو نہیں ہیں۔ انہیں بھی آرام کا حق ہے۔ آج چھٹی کر لیتے تو خاص نقصان تو نہ ہوتا۔ ابا ذرا آرام کر لیتے۔"

وہ شرمندہ ہو کر واپس جانے لگتے تو بے قراری سے کہتی۔ "اچھا اب بیٹھو پھر مجھے الزام دو گے کہ واپس کر دیا۔ پڑھنے نہیں دیا۔ ابا بھی مجھے ڈانٹیں گے۔ کئی دفعہ پوچھ چکے ہیں تمہیں۔ چلو بیٹھو، چائے لاتی ہوں۔"

اس کی چائے میں جانے کیا مزا ہوتا، وہ دو پیالی پی جاتے اور ذائقے کی تشنگی باقی رہتی۔ اس دوران وہ مسلسل بولتی رہتی۔ کبھی لطیفے سناتی اور خوب ہنستی۔ کسی کو پریشان دیکھتی تو اس کی دلجوئی کے لیے خود آگے بڑھ کر ہمدردی کرتی۔

محلے کے لڑکے جو پڑھنے آتے تھے، وہ سب رابعہ کے بھائی بنے ہوئے تھے۔ شنو بھائی کا ہاتھ کٹ گیا تو پٹی رابعہ کو باندھنی ہے۔ ٹلو کی دادی سو گئی ہے، ٹلو کو حرارت ہے۔ دوائیں رابعہ ہی لا کر کھلائے گی۔ وہ اس کی اس بے تکلفی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ذرا سا اعتراض کر دیتے تو وہ جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ جاتی۔

"آپ کی سوسائٹی میں ہمدردی قابل نفرت ہے مگر ہم...... ہم تو اسے عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ آج ہم ان سے ہمدردی کریں گے تو ہمارے آڑے وقت میں یہی ہماری مدد کو آئیں گے۔ آپ نہیں اور پھر یہ سب میرے بھائی ہیں۔"

وہ سخت اشتعال میں آ جاتی۔

"اچھا رابی! جانے دو یار، بہت حبس ہے۔" وہ اسے بہلانے، موضوع سے ہٹانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے۔

"اور میں جو اتنی دور سے آیا ہوں۔" وہ رعب جماتے۔

"تو مت آتے۔" وہ جھلاتی۔

"بھئی خلاصت ہو، میں نے کچھ کر دیا کیا؟"

"تم کچھ کر بھی لو گے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ بڑے آدمی کے بیٹے ہو، صاف بچ جاؤ گے۔ شامت تو مجھ غریب کی آئے گی۔ ماسٹر کی بیٹی کی کیا حیثیت؟"

"ارے بھئی ہوا کیا ہے؟" وہ پریشانی سے اس کے قریب جاتے تو وہ دور کھسک جاتی۔

"کچھ ہونا باقی ہے کیا؟ وہ چچا مستقیم کے صاحبزادے، وہ چنگی داڑھی والے نہیں؟ مجھ سے کہنے لگے کہ سعود کو تو روز چائے بنا کر پلاتی ہو، ہمیں پوچھتی تک نہیں ہو۔ حاتم نے اور چھوٹے والے بولے کہ بھئی سعود تو ٹھہرے بڑے آدمی، ان کی عزت تو ماسٹر صاحب بھی کرتے ہیں۔ دیر تک پڑھاتے ہیں۔" وہ چڑ کر ان کی نقل اتارتی۔ "جو کہیں چچی نے ان کو ذرا سی ڈھیل دی ہوتی تو وہ تو سر پر ناچتے۔ ابھی تو آتی جاتی کے بعد مجھ سے توجہ اور چائے کے طلبگار ہیں جی؟"

سعود پریشان ہو گئے۔ یہ تو اچھی بات نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ ماموں انہیں بطور خاص پڑھاتے، خود رابعہ سے کہہ کر چائے منگواتے۔ ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کی طرح باتوں میں بھی علمیت کا وقار ہوتا۔ مستقیم کے دونوں بیٹے عام شاگردوں کی طرح سب کے ساتھ رخصت ہوتے بلکہ محلے کے لڑکوں کی بھی ان کے نزدیک کافی اہمیت تھی۔ شاید اسی لیے وہ دونوں اپنی ہتک محسوس کرتے تھے۔ ویسے ماسٹر صاحب کسی میں امتیاز برتنے کے قائل نہ تھے۔ ان دونوں کو بھی شفقت اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔

مگر ان کا یہ عمل بس پڑھائی تک محدود تھا جبکہ سعود ان کے سب سے پرانے شاگرد اور ان کی پسندیدہ ہستی ہونے کی وجہ سے شاید ذاتی طور پر زیادہ نزدیک تھے۔ وہ سعود کے والد کو بہت پسند کرتے تھے جو اپنی ذاتی محنت سے ترقی کر کے سرمایہ دار طبقے میں جگہ بنا سکے تھے۔ انہوں نے کئی بار ان کی جدوجہد اور کوششوں کو سراہا اور کہا۔ وہ محنت و مشقت اس علم سے بدرجہا بہتر ہے جو انسان کو سبق نہ سکھائے۔

وہ تعلیم سے فارغ ہو کر بھی ماسٹر صاحب سے ملنے، ان سے کچھ پوچھنے، مشورہ کرنے ضرور جاتے۔ اب رابعہ میں بھی ایک گہرائی، ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ حیا کی چادر نے درمیان میں جگہ بنا لی تھی، انہیں دیکھ کر وہ اندر چلی جاتی اور خاموشی سے چائے بنا کر لے آتی۔ اس میں بے حد سلیقہ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اس نے کبھی اپنی زبان سے کم آمدنی یا غریبی کی تنگی کا ذکر نہیں کیا تھا جبکہ سعود اپنی امی کی زبان سے اکثر ایسے شکوے سنتے رہتے تھے کہ خرچ پورا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ بے اختیار ہو کر رابعہ کی جانب دیکھتے۔ وہ نظر چرا کر کسمسا کر رہ جاتی، جھینپ جاتی مگر ان کو اپنے اس بے اختیار جذبے پر قابو نہ تھا پھر وہ تنگ آ کر ہنس دیتی۔ اسے ہنسی بہت آتی تھی مگر لحظہ بھر میں اسے غصہ دلانا مشکل نہ تھا۔ کبھی وہ طنز سے کہتی۔

"جناب کی والدہ آج آئی تھیں۔"

وہ کہتے۔ "تم پھپھو نہیں کہہ سکتیں انہیں۔"

"پھپھوئیں تو میری ایک درجن ہیں مگر آپ کی والدہ کو ہمارے اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں آ کر ہتک محسوس نہیں ہوتی اور اس بات پر ہم بہت ممنون ہیں ان کے۔"

"تمہارے خیالات بہت فرسودہ ہیں۔ آج کل کوئی نئے پرانے گھر کی پرواہ نہیں کرتا، گھر ہونا چاہیے۔"

"مگر لوگ ہم سے بچتے ہیں۔" وہی پرانا شکوہ ابھی تک تازہ تھا۔

"لوگوں کو بہت کام ہوتے ہیں، فرصت ہی نہیں ہوتی۔" وہ اسے سمجھاتے۔

"جی نہیں، ابھی ابا سے کسی کا کام اٹکا ہوا ہو تو دیکھیے کیسے ہاتھ باندھے آتے ہیں سب۔"

رابعہ کو سمجھانا بہت مشکل تھا پھر بھی وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی جب ان کی وہاں آمدورفت رہی تو ان کے والد نے ٹوکا تو انہوں نے کہا۔

"اگر میں جانا چھوڑ دوں تو خود غرض سمجھا جاؤں گا جو مطلب نکلنے کے بعد استاد کے رشتے اور حق کو فراموش کر دیتا ہے۔"

"آپ کی والدہ ماجدہ کی تشریف آئی تھی آج۔" ایک دن وہ گئے تو کڑی کمان کے تیر کی طرح وہ ان پر لپکی۔ وہ اس کے لہجے سے ڈر گئے۔ یہ بھی نہ کہا کہ وہ تمہاری پھپھو ہیں۔

"ہوا کیا؟"

"وہی جو آپ کے طفیل سے امید ہو سکتی ہے۔ ابا کو مجبور کر رہی تھیں کہ وہ شادی کر لیں یا پھر......"

"یا پھر---؟" وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگے جو ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"یا پھر میرے لیے ایک سنہری پنجرے کی پیشکش لائی تھیں، بطور خاص۔"

"بطور خاص۔ مطلب؟ کیسی پیشکش؟"

"اپنے ایک ملازم کا رشتہ۔ کوئی آفت مرزا ہیں جنہیں کوئی رشتہ نہیں ملا تو مجھ پر نظر کرم......"

وہ بے حد اشتعال میں تھی اور اس سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔ صباحت مرزا سعود کے والد کے دواخانے میں ملازم تھا۔ انہیں اپنی ماں سے یہ امید نہ تھی۔ صباحت مرزا بہت عیار اور چالاک تھا۔ رابعہ کے جانے کے بعد ماسٹر صاحب نے ان سے پوچھ لیا۔

"صباحت مرزا کو جانتے ہو بیٹا؟ کون ہے، کیسا ہے؟"

انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ "اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے ماموں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ تھکن ان کی آنکھوں میں نمی بن کر چمک رہی تھی۔ وہ بہت دل برداشتہ لگ رہے تھے۔ سعود نے امی سے کہا۔

"آپ ماموں کے گھر کیوں گئی تھیں؟"

"کیوں؟ رشتہ لے کر گئی تھی۔ کب تک لڑکی کو بٹھائیں گے۔" وہ بیٹے کے چہرے کے ناگوار تاثرات دیکھ کر مشتعل ہو گئیں۔ "لوگ باتیں بناتے ہیں۔ جوان جوان لڑکے پڑھنے آتے ہیں۔ ارے بھئی کسی کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیں۔"

"امی! کیسی باتیں کرتی ہیں۔" وہ بھنا گئے۔ "پڑھنے جانے والے لڑکے کیا شادی کی درخواست لے کر جاتے ہیں۔ آپ...... آپ صباحت مرزا کے لیے کیوں گئی تھیں؟" وہ رنجیدہ ہو گئے۔

"تو کیا تمہارا رشتہ لیکر جاتی تو وہ خوش ہوتے۔" امی نے چڑ کر کہا۔

وہ منانے میں آ گئے پھر ہمت کر کے بولے۔

"امی اگر اس میں حرج بھی کیا ہے۔"

"ہاں، میں تو سمجھ گئی تھی۔ وہ یہی چاہتے ہیں مگر یاد رکھو تمہارے باپ برابر والوں میں شادی کریں گے تمہاری۔"

سعود چکراتے سر کو ہاتھوں میں لیے بیٹھے رہے۔

"برابر والوں میں...... برابر والوں میں۔ کیسے ہوتے ہیں برابر والے۔ ماموں ہم سے کس بات میں کم ہیں؟ وہ غریب ہیں۔ ماسٹر ہیں۔ بس یہی فرق ہے تو رابعہ کے خیالات ٹھیک تھے۔ اس کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ وہ گھر میں بیٹھنے والی لڑکی ان کے مقابلے میں زیادہ سمجھدار تھی۔ کئی دن بعد وہ ڈرتے ڈرتے پھر ان کے گھر گئے۔ ماسٹر صاحب نے پرتپاک خیر مقدم کیا مگر رابعہ سر پر دوپٹہ ڈال کر اندر چلی گئی۔ اس کا ایک رخ اس دوپٹے سے چھپ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد چائے لے کر آئی اور پیالی سامنے رکھ کر اسی طرح منہ چھپائے پھر چلی گئی۔

"کیا بات ہے ماموں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کیا بیمار ہو گئے تھے۔ مجھے بلا لیتے۔" انہوں نے ماموں کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھ لیا۔

"ارے بیٹا! بیمار تو نہیں ہوں مگر چار پانچ دن سے اذیت میں مبتلا ہوں۔"

"خیریت۔" وہ گھبرا گئے۔

"بیٹا! اب سے پہلے میں بے حد بے فکر تھا۔ جانتا نہیں تھا کہ بیٹی کے گھر والوں کو کیسی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اللہ پر بھروسہ کیے بیٹھا تھا مگر ادھر چند دن سے رابعہ کے لیے رشتے آ رہے ہیں اور میں نہ اقرار کر سکتا ہوں اور نہ انکار کی پوزیشن ہے۔ ابھی مجھے جلدی بھی نہیں ہے مگر حمیرہ بہن پہلے کسی صباحت مرزا کا پیام لے کر آئی تھیں، اب مستقیم کے ساتھ ان کے بیٹے کا رشتہ لائی ہیں۔" سعود سانس روکے بیٹھے رہے۔

"اب وہ کہتی ہیں کہ میں تو اقرار کروا کے دم لوں گی اور میں شادی کے معاملے میں لڑکی کی مرضی کو اولیت دیتا ہوں۔ یہ اس کا حق ہے اور شریعت میں بھی حکم آیا ہے۔"

"وہ کیا کہتی ہے؟" سعود نے سانس لے کر کہا۔

"کہے گی کیا، بس میرا بہانہ بنا کر انکار کر دیا اور میں بھی مستقیم کے بیٹے کے حق میں نہیں۔"

"مگر کیوں ماموں؟" سعود نے پوچھا۔ "وہ تو کھاتے پیتے لوگ ہیں۔"

"اسی لیے، رابعہ کو وہاں احساس کمتری ہوگا اور اس کا مزاج بھی ان لوگوں سے نہیں مل سکتا۔ مجھے اندازہ ہے۔ میں اس کی شادی کسی اپنے جیسے ماسٹر سے ہی کروں گا۔"

وہ یہ بھی نہ کہہ سکے کہ اسے اپنے جیسے ماسٹر کے حوالے کر کے زندگی بھر کے لیے تنگیوں کا چارہ مت بنائیں ماموں۔

مگر وہ چپ رہے۔ اندر آ کر رابعہ کو ٹٹولنا چاہا۔ وہ خفگی سے دور چلی گئی۔

"ارے میں نے کیا کہا ہے بھئی! ابا سے ناراض ہو۔"

دوپٹے کی اوٹ سے اس نے آنکھیں چمکائیں۔ سیاہ بولتی ہوئی روشن آنکھیں۔

"اپنی اماں جان کو منع نہیں کر سکتے" وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔"

"وہ بقول تمہارے، میری اماں جان ہیں۔ میں ان کا ابا جان نہیں کہ وہ میری بات مان لیں اور مجھے خبر بھی نہیں۔"

"اچھا بس، اگر آئندہ انہوں نے میری فکر میں دبلا ہونے کی کوشش کی تو میں......"

"تو کیا کرو گی؟ بولو۔" انہیں رابعہ کا لہجہ بہت برا لگا۔

"بس چپ ہو جاؤں گی، زہر کھا لوں گی اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

"میں کب تک ان بڑوں سے لڑ سکتی ہوں۔" سعود نے سر جھکا لیا۔ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ "اچھا اب رونا دھونا بند کرو۔ مجھے بتاؤ تم چاہتی کیا ہو۔"

"میرے چاہنے سے بھلا کیا ہوتا ہے"

"پھر کس کے چاہنے سے کچھ ہوگا"

"آپ کے......" اس کے منہ سے تیر کی طرح وہ لفظ نکلے اور وہ خود اپنی جرأت پر ششدر رہ گئی۔

سعود کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس قدر صاف بیانی کی تو وہ توقع بھی نہیں کر سکتے تھے مگر دل میں خوشگوار دھڑکنوں نے ہلچل سی مچا دی۔ آرزو مچل مچل کر کہہ رہی تھی۔

"ہاں میرے چاہنے سے ہی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں چاہوں تو...... میں اسے چاہتا تو ہوں۔"

اس دن انہیں اس شدید اور پاک مصفا محبت کا احساس ہوا تو وہ اس جذبے کی گہرائی اور شدت سے گھبرا گئے۔ ڈر گئے اور رابعہ کی دلیری و سچائی سے ہار گئے۔ اظہار محبت یوں بھی تو ہوتا ہے۔ وہ اس بار بھی ان سے بازی لے گئی۔ اپنا مافی الضمیر ان پر ظاہر کر کے سہم گئی۔ خاموشی کا طویل وقفہ آیا۔ اس دوران انہوں نے غور کیا، سوچتے رہے۔ اپنی چاہت، جو رگ و ریشے میں پیوست تھی۔ جدائی کا تصور خون کو سرد کر دیتا تھا اور امیدیں بہت بندھا رہی تھیں۔

امی نے صاف طور پر برابر والوں میں شادی پر زور دیا تھا مگر انہیں امید تھی، وہ اس معاملے سے نپٹ لیں گے۔ ابا شاید اختلاف کریں مگر لاڈلے ہونہار لائق بیٹے کی خواہش پوری کرنا اتنا ناممکن نہیں۔ انہیں یقین تھا، ان کی سچی محبت اور پاک جذبہ ہر رکاوٹ پر حاوی ہو جائے گا۔ وہ ہمیشہ ماں باپ کی اطاعت کرتے رہے تھے۔ ماں باپ بھی ان کے دشمن تو نہیں۔ دقت سے سہی مگر مان لیں گے۔

ایک موہوم سی امید پر وہ وعدہ کر بیٹھے۔ وعدہ...... محض بات ٹالنے یا وقت گزارنے کیلئے نہیں، پوری زندگی کی راحتوں اور خوشیوں کے حصول کیلئے کیا تھا مگر یہاں بھی ان کے ارادے کو شکست فاش ہوئی۔ امی تو سن کر اچھل پڑیں۔

"آخر اس میں کمی کیا ہے؟ مجھے قائل تو کیجئے امی!"

"کمی نہیں ہے۔" امی نے افسردگی سے کہا۔ "مگر میری بھتیجی ہے وہ...... اور تمہاری ددھیال کے لوگ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیں گے۔ میری سگی بھتیجی ہی انہیں قابل قبول نہ ہوگی، نہ کہ غریب ماسٹر اور وہ بھی چچا زاد بھائی۔ تمہیں بیٹے! یہ بات منہ سے بھی نہ نکالنا۔"

"سکول ماسٹر اتنا ہی حقیر ہوتا ہے تو یہ اونچی ناک والے لوگ اپنے بچوں کو اس کے پاس بھیجتے ہی کیوں ہیں؟" انہوں نے بھنا کر کہا۔

"بس ایسی ہی مجبوری ہے اور ویسے بھی اب استاد کا ادب و احترام کون کرتا ہے۔"

"اس کے ذمہ دار بھی یہ معزز والدین ہیں۔ وہ خود عزت کرنا نہیں جانتے۔ امی! استاد تو والدین سے زیادہ عزت و احترام کے قابل ہوتے ہیں۔"

"بیٹا! جو نہیں ہو سکتا، اس کیلئے ضد مت کرو۔ تم کسی چچا، پھوپھی کی بیٹی کا نام لو تو جھٹ منگنی پٹ بیاہ ہو سکتا ہے۔"

"لیکن میری زندگی کے معاملات میں چچا، پھوپھی کا کیا دخل ہے۔ شادی میری ہوتی ہے، میری مرضی سے ہونی چاہیے۔"

"تمہارے ابا اپنے بھائی بہن کی رائے کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے اور میری بھتیجی تو خیر کسی کو بھی قبول نہیں ہوگی۔ وہ بھی بے مایہ غریب لڑکی۔"

"میں ابا سے بات کرتا ہوں۔" انہوں نے عزم سے کہا۔

"ارے ایسا غضب نہ کرنا۔" امی نے گھبرا کر کہا۔ "وہ پہلے ہی مشکوک ہیں۔ کہہ رہے تھے۔ بلا ضرورت ماسٹر صاحب کے گھر کے چکر لگ رہے ہیں، کوئی علت ہے ضرور۔ اس کے بعد ہی میں وہ رشتہ لے کر گئی تھی۔ اب وہ مجھ پر بگڑیں گے کہ میں نے شہ دی ہوگی۔"

مگر ماں کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے خط کے ذریعے والد تک اپنی خواہش پہنچا دی۔ وہ تو پہلے ہی کھٹک گئے تھے۔ خط کا جواب دیے بغیر سعود کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بسرعت لندن بھیجنے کا انتظام کر دیا۔ چونکہ یہ ارادہ ان کا پرانا تھا اس لئے سعود کچھ کہہ نہ سکے مگر ایک دن جواب لینے ان کے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے نرم اور سیدھے صاف الفاظ کے جواب میں باپ نے توقف کیا پھر بے حد تفصیل سے آگاہ کرنا چاہا۔ وہ نقصانات جو ماسٹر کی بیٹی سے شادی کے بعد انہیں اٹھانا ہوں گے۔

غریب گھر کی بیٹی بڑے گھر کی بہو بن کر خود کو کوئی اعلیٰ و ارفع شے سمجھتی ہے۔ خاندان میں بہت سی لڑکیاں موجود ہیں، ان کی توہین وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار وجوہات تھیں۔

سعود نے بھی ان باتوں کا جواب مدلل طریقے پر دیا اور یقین دلایا کہ وہ بہت ذہین، حساس اور خدمت گزار لڑکی ہے۔ آپ دونوں کی خدمت کرے گی اور ہمیشہ ممنون رہے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جاہل نہیں ہے۔

"اور وہ ماسٹر...... بیٹی کے بہانے روز آیا جایا کرے گا۔" انہوں نے نہایت حقارت سے کہا۔

"ماموں ہیں وہ میرے" سعود بھڑک اٹھے۔ "آپ نے خود انہیں میرا استاد مقرر کیا تھا اور دونوں رشتے قابل احترام ہیں ابا! میرے لئے وہ آپ سے کم نہیں ہیں۔"

"ہوں" انہوں نے لمبی ہوں کے بعد توقف کیا۔ "تو یہ حالات ہیں، ابھی سے ان کی حمایت کی جا رہی ہے۔ شادی کے بعد تو تم میرے سر پر جوتے رسید کرو گے۔"

سعود بھونچکا ہو گئے۔

(جاری ہے)

سائبان

آسیہ رزاقی

قسط نمبر 4

وہ نقلی ہو گئے "ابّا پلیز! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"دیکھو میاں! ابھی میں زندہ ہوں۔ یہ گھر، یہ سرمایہ سب میرا ہے اور تم میرے بیٹے، میرے نام سے الگ ہو کر کچھ نہیں ہو۔ میں کسی قیمت پر تمہاری شادی اس کنگال کی بیٹی سے نہیں کروں گا۔ اگر تم کو ضد ہو گئی ہے تو اپنی ضد پوری کر لو۔ دروازہ کھلا ہے۔ جاؤ" چلے جاؤ مگر اس کے بعد یہ دروازہ بند ہو جائے گا اور تم ماں باپ کی صورت دیکھنے کو ترس جاؤ گے۔ پڑھے لکھے ہو ماسٹری تو مل ہی جائے گی۔ وہ بیں بھی اسی قابل اور تم بھی انہی کی سطح کے نظر آ رہے ہو۔ شاید کچھ دن تم کو فاقے بھی کرنا پڑیں کیونکہ ماسٹر کے گھر میں تو ان کے پیٹ بھرنے کا سامان بھی نہیں۔ تم کو کہاں سے کھلائیں گے۔ خیر فاقے بھی کر لینا۔ دل کے فیصلے کے آگے فاقوں کی کیا حقیقت اور اس کے بعد تم کوئی حلوائی کی دکان کھول لینا" کما کھاؤ گے۔ خاندان کا نام روشن ہوگا۔ چلو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ دوسری صورت میں اعلیٰ تعلیم اعلیٰ پوزیشن اور روشن مستقبل ہے۔ جب لندن سے آؤ گے تو ماسٹر کی بیٹی خود تم ہی کو ناپسند ہوگی۔"

باپ کے جلال اور تصویر کے دونوں رُخ دیکھ کر ان کے سارے جذبے سرد پڑ گئے۔

والدین سے علیحدگی' اعلیٰ تعلیم کو خیر باد کہنا' مستقبل کی تاریکی اور سب سے بڑھ کر باپ کی نافرمانی کی ان میں ہمت نہ تھی۔ وہ جس بات پر اڑ جاتے پھر انہیں مجبور کرنا ناممکن تھا۔ وہ سر جھکا کر واپس اپنے کمرے میں آ گئے اور اپنی معصوم و نوشگفتہ محبت کے قبل از وقت مرجھانے پر رونے لگے۔ دل بھر آیا اور آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ بہت سوچتے رہے۔ دل خون ہوتا رہا مگر باپ پر فتح پانے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ ان کے کئی دوست ملازمت کیلئے سرگرداں تھے۔ کسی کو ملازمت ملی بھی تو نہایت معمولی اور یا پھر عارضی۔ وہ دیکھتے ہی تھے۔ کس طرح وہ لوگ تگ و دو میں مصروف تھے پھر بھی مرضی کے مطابق کام نہیں ملا۔

ان میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی' کسی سے واقفیت نہ تھی۔ وہ تو باپ کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ پوری رات اور پورا دن کشمکش میں گزر گیا۔ مستقبل کو داؤ پر لگانے کے لئے خود کو تیار نہ پاتے۔

آخر کار ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ رابعہ کو بھول جانے کا فیصلہ کر کے وہ خود سے شرمندہ نہ تھے کہ یہاں کے ماں باپ کا حکم اور ان کی بہتری کا راستہ تھا اور وہ نافرمان کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔

رابعہ نے ان کی آنکھوں میں بشاشت تلاش کرنی چاہی اور اس میں ناکام رہی۔ وہ خود افسردہ ہو گئی۔ اس نے اپنا نوشتہ تقدیر ان کے چہرے پر دیکھ لیا اور سانس روک کر ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ انہوں نے اپنی ناکامی اور بے بسی کو چند الفاظ میں بیان کیا تو رابعہ خوف زدہ ہو گئی پھر انہوں نے دوستی اور رشتے داری کے واسطے سے ہمیشہ ملنے اور اس کا خیال رکھنے کا وعدہ کیا۔

رابعہ بپھر گئی۔

"وعدہ..... آپ کے وعدے کچے دھاگے جیسے ہوتے ہیں۔ میں تو آپ کی رشتہ داری پر ہی نادم ہوں۔ دوستی کو نبھانے کی آپ میں ہمت نہ ہوگی اور یہ تو میرا وہ جرم ہوگا جس کی سزا آپ کے والدین اور آپ کی پوری سوسائٹی مجھے تا زندگی دیتی رہے گی۔"

"بدگمانی سے کام نہ لو رابی! میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں اور میرے والدین کے بھی کچھ مسائل ہوں گے جو میری خواہش وہ پوری نہیں کر سکے۔"

"آپ کی خواہش! آپ کے مسائل۔ واہ..... ہمارے مسائل سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ جن سے نپٹنے میں ہماری تمام زندگی گزر جاتی ہے اور ہر مسئلہ جوں کا توں قائم رہتا ہے اور سنا ہے کہ دولت ہر زخم کو مندمل کر دیتی ہے اور ہر خوشی خرید سکتی ہے۔ آپ کے زخم بھی مندمل ہو جائیں گے اور آپ خوشیاں بھی خرید لیں گے۔ چلئے مبارک ہو۔ ہم اپنے زخموں اور دکھوں کے ساتھ جی لیں گے۔ آپ کے بغیر مر نہیں جائیں گے۔" وہ اب شدت غم سے کانپنے لگی۔

"دیکھو رابی! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے پاس دولت ہے نہ اختیار۔ میں اپنے والد کا دست نگر ہوں۔ مجھے اعلیٰ تعلیم کی تمنا ہے جو میں ابّا کی وساطت سے حاصل کر سکتا ہوں۔ بگاڑ کر کے اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ابّا کا سہارا چاہیے اسی میں مصلحت ہے۔"

"دیکھا وہی مصلحت جس لفظ سے مجھے چڑ ہے اور یہ لفظ آپ لوگوں کے ہر مقصد کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ یہ آپ نہیں' آپ کے طبقے کی مجبوری ہے۔ جائیے میں نے آپ کو اس بے طاقت کے نام پر آپ کو معاف کیا۔"

انہوں نے سینے میں اٹکا ہوا سانس باہر نکالا۔ کسی نام کی طور کسی اس نے انہیں معاف کر دیا تھا۔

"ماموں کہاں ہیں؟"

"میں نے انہیں بہانے سے باہر بھیج دیا تھا۔ مجھے یقین نہ تھا مجھے اپنے مقدر پر یقین نہیں اپنے آپ پر اعتبار نہیں تو آپ کے وعدے پر کیسے اعتبار کرتی۔ اسی لئے ابّا کو سودا لانے بھیج دیا کہ وہ کچھ سُن نہ سکیں۔"

رابعہ کے چہرے پر محبت کی ناکامی کا دکھ سیاہی بن کر پھیل گیا۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں اور اس کے آنچل نے ان سے پردہ کیا ہوا تھا۔

"میں نے کوشش کی تھی رابی! کہ میں تمہیں ایک روشن مستقبل دینا چاہتا تھا۔ میں نے تم کو دل سے چاہا ہے اور ماموں کے احسانات نے مجھے سر اٹھانے کے لائق نہیں رکھا ہے۔ میں ان کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ زندگی کا مجھے تجربہ نہیں مگر کتابوں سے میں نے سیکھا ہے۔ زندگی روزانہ نت نئے امتحانوں سے گزر کر یقین بنتی ہے اور ہمیں بھی اس امتحان سے گزرنا ہے۔ تم ناراض نہ ہو پلیز' ہم بچے ہیں تو ہمارے راستے ایک ہوں گے' کبھی نہ کبھی دیر یا سویر۔"

رابعہ بھک سے اڑنے والے مادے کی طرح بھڑک گئی۔ سر سے دوپٹہ نوچ کر چیخ کر بولی۔

"میں کیوں ناراض ہوتی آپ سے۔ آپ کون ہوتے ہیں میرے جو میں ناراضگی کا حق استعمال کروں۔ امتحان بھی آپ لیتے ہیں اور سرخرو بھی آپ ہوتے ہیں۔ ہم جیسے بے مایہ بے بس لوگ تو زندگی کے سامنے ہار جاتے ہیں۔ ہر امتحان میں فیل ہونا اور آزمائش میں ناکامی ہمارا مقدر ہے' آپ کا نہیں۔ آپ ہمیشہ سے بچ کی مشعل جلاتے ہیں اور ہم جھوٹے کہلاتے ہیں۔ جائیے آپ کا اور میرا راستہ آج سے الگ ہو گیا ہے۔ خدارا اب تو ہمارا پیچھا چھوڑ دیجئے یا ابھی اور ذلیل کرنے کے ارادے ہیں۔"

مسعود کی روح پر بچ کے تازیانے پوری قوت سے لپک رہے تھے۔ ان کا وجود درد و کرب سے تڑپ رہا تھا لیکن رابعہ کی زبان رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اشتعال میں اس نے دوپٹہ پھینک کر ان سے ہر تعلق توڑ لیا ہے۔ یہی دوپٹہ تو ان کے درمیان تھا۔ کبھی خفگی کے اظہار میں چہرہ ڈھانپ لیتا تھا، کبھی شوخی سے آنچل لہراتا اور ان سے چھو جاتا۔ یہ اشارے کنائے اپنائیت کو ظاہر کرتے تھے اور وہ اپنے دوپٹے کو پھینک کر چلی گئی۔ گویا نہ کوئی رشتہ رہا نہ خفا ہونے اور منانے کا تعلق۔ آج وہ بچ بچ ان کے راستے سے ہٹ گئی تھی۔ وہ باہر آ کر دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ گئے اور اپنے گھر جانے والے راستے کو تکنے لگے۔ تب ہی اندر سے ماموں کے بگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"اس قدر دکھ اس کرنے کی کیا ضرورت تھی، کتنی مرتبہ سمجھایا ہے۔ لڑکیوں کو زبان کا استعمال کم سے کم کرنا چاہیے۔ کچھ عقل کو بھی کام میں لانا چاہیے۔"

"میں غلط بات نہیں کرتی ابّا!"

"غلط اور صحیح کا فیصلہ تو میں بھی نہیں کر سکتا مگر تم نے میری تربیت سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ اس قدر جوش اور غصے میں آ کر کیا ثابت کرنا چاہتی تھیں تم۔ وہ اپنے ماں باپ کے احسانات کو فراموش کر کے تمہارے اشاروں پر چلے، سب کچھ چھوڑ دے اور تم اسے کیا دو گی؟ بدنامی، رسوائی، ذلت، غربت۔ بیوقوف ایک راستے پر لے جانا چاہتی تھیں تم، مجھے بتاؤ۔ تباہی کے راستے پر۔ آج تم نے مجھے کس قدر ذلیل کر دیا۔ میں تو شرم کے مارے گھر سے باہر نہیں نکلا۔ کیا کہے گا وہ۔ یہی تعلیم ہے ماموں کی، یہ تربیت ہے۔"

ماموں غصے میں تھے مگر نہایت تحمل سے بول رہے تھے۔

"تو ابّا! آپ مجھے آواز دے دیتے، میں چپ ہو جاتی۔" رابعہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ شاید بہت شرمندہ تھی۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ تم کو شرمندہ کروں اور اس پر ظاہر ہو کہ میں نے سُن لیا ہے۔ وہ بھی شرمسار ہو جاتا۔ بیٹے! صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ ہمارا کسی پر کیا حق ہے، ہم نے کسی کو کیا دیا ہے جو معاوضے کی توقع کریں۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے، وہ ہمارا سرمایہ ہے۔ ہماری آن اور وقار ہے۔ کیا ہم اپنا سرمایہ کسی کو دے دیں گے پھر کسی سے اس کا سرمایہ کیوں کرنے لگیں گے۔ مسعود اپنے ماں باپ کا سرمایہ ہے، اسے وہیں رہنا چاہیے۔ ماں باپ اپنی اولاد کے بہتر نگہبان ہوتے ہیں۔ آئندہ میں تم کو ایسی خود سری کی اجازت نہیں دوں گا۔ تم نے میرا سر نیچا کر دیا ہے مجھے تم پر فخر تھا مگر آج یہ فخر بھی مٹی میں ملا دیا۔"

"ابّا جی..... ابّا جی..... معاف کر دیں مجھے۔" وہ بلک بلک کر رونے لگی اور باہر بیٹھے مسعود کے دل پر ماسٹر صاحب کی عظمت کے نقش کچھ اور گہرے ہو گئے۔

کلاک نے دو بجائے، مسعود نے چونک کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بارش کم ہو گئی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں ماحول کو پُراسرار بنا رہی تھی۔ مسعود کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ آج ماضی نے پھر انہیں یاد دلا دیا تھا۔ ماموں کی وہ معذرت طلب کرتی نمناک آنکھیں انہیں یاد آ کر ہمیشہ بے چین کر دیتی تھیں۔ انہوں نے مسعود کو باہر سے اٹھا کر کمرے میں لا کر بٹھایا اور رابعہ کو مجبور کیا کہ معافی مانگے۔

رابعہ کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ ان کی آنکھیں اداس اور بھیگی ہوئی تھیں۔ بس اس دن کے بعد وہ وہاں نہیں گئے۔ لندن چلے گئے۔ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ آج رابعہ کو دیکھ کر وہ یاد پھر اسی طرح تازہ ہو گئی جیسے ابھی کل ہی ماموں نے انہیں بازو سے پکڑ کر اٹھایا ہو اور بھرے گلے سے کہا ہو۔

"میرے بیٹے! اندر چلو یہ جگہ تمہارے بیٹھنے کے لائق نہیں۔ تم میرے دل میں رہتے ہو، میں نے تمہاری ذات میں اپنا آپ دیکھا ہے۔ میں اس کو دیکھ دیکھ کر زندہ ہو جاتا ہوں۔ میرا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔"

پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ مسعود پر ان کی آواز اور درد بھرے لہجے نے بہت اثر کیا تھا۔ انہوں نے اپنے جوان گرم ہاتھوں میں ان کے سوکھے مختنی ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔

"ماموں..... کبھی نہیں، میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

لیکن اس کے بعد وہ ان سے نہیں ملے اور اب رابعہ نے پھر یاد دلایا تھا۔ وہ جو سب کچھ بھولنے کی کوشش میں اپنی ذات فراموش کر بیٹھے تھے۔ اپنی نو بیلی معصوم محبت کی پلاکت پر بھی وہ یہ نہ جان سکے تھے کہ یہ اتنی گہری اور پائیدار ہو گی کہ ان کے ذہن سے اس کا خیال کبھی نکل نہ سکے گا۔ انہیں اس کا اندازہ اس دن بھی نہیں ہو سکا تھا جب اپنے فیصلے کے انتخاب پر وہ مطمئن تھے لیکن اب وہ کہہ سکتے تھے کہ اپنا روشن مستقبل اعلیٰ تعلیم والدین کی جدائی برداشت کر کے قربانیاں دے کر اگر صرف ذرا سی ہمت اور اپنی محبت پر اعتماد کر لیتے تو۔

ان کی روکھی بے رنگ زندگی نے جس طرح والدین کو تڑپایا تھا اور سفینہ سے بے نیازی کا سلوک کر کے اس کی زندگی کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اس وقت کم ہمتی کے جال سے نکل آتے تو حالات دوسرے ہوتے۔ ماں باپ کو کچھ دن بعد منا ہی لیتے۔ یورپ کی ڈگری کو ضروری نہ سمجھتے اور صرف رابعہ کا حصول ضروری سمجھتے تو نہ ماسٹر صاحب اس کسمپرسی سے مرتے، نہ احد کا بچپن بے ماں کے گزرتا۔ نہ سفینہ کی زندگی خراب ہوتی۔

مگر وہ اس وقت اتنے پُراعتماد نہ تھے اور رابعہ اگر ان کو خود غرض سمجھتی تھی تو وہ اتنی غلط بات بھی نہ تھی۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے پھر کھڑکی کے پاس آ رکے۔ باہر اندھیرا تھا اور سرد ہوا کا شور۔ رابعہ شاید سو چکی ہوگی۔ اسے علم ہی نہیں کہ ان کے زخم آج تک مندمل نہیں ہوئے۔ ان زخموں کو مرہم نصیب نہیں ہوا۔ البتہ انہیں نوچنے کا فرض وہ خود ادا کرتے رہتے تھے تاکہ تازہ لہو کی مہک ان کو یاد دلاتی رہے۔ انہوں نے محبت کی تھی۔ بے مثال محبت، بے غرض محبت۔

وہ رابعہ کو بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کی محبت ازل دن سے اسی طرح تازہ ہے جیسے ہوا کے مست جھونکے اور اس محبت کو انہوں نے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ پرورش کی ہے اور کبھی اس سے جدا ہونے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ سفینہ بھی انہیں نہیں ورغلا سکی۔ جانے دل اور دماغ پر برسوں سے اداسی کی تہیں جم رہی تھیں۔ ان کا رنگ بدلنے لگا تھا یا موسم نے جو انگڑائی سی لی تھی، اس کا اعجاز تھا یا رابعہ کی آمد اس کا سبب تھا۔

وہ آج ہمیشہ سے زیادہ پُرامید اور پُراعتماد محسوس کر رہے تھے خود کو۔ رابعہ کی آمد کا سبب جانے بغیر وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے۔ کیا تم نے بھی میری محبت کی حفاظت کی ہے اور اس تعلق سے کبھی میری یاد کو دل و دماغ میں چمکتے دیکھا۔ کبھی میرا نام تمہارے ہونٹوں تک آیا۔ ایسے کہ لب نہ ہلیں، آواز نہ آئے اور نام ہونٹوں کو چھوتا رہے۔ میری طرح۔ رابی! میں نے ہمیشہ تمہیں ایسے ہی یاد رکھا ہے اور کبھی کسی سے ویسا تعلق محسوس نہیں کیا۔ سفینہ سے بھی نہیں جو میرے بیٹے کی ماں بنی۔

رابی! تم سو رہی ہو اور تمہارا نام اس کمرے، اس وجود میں ایسے زندہ ہے جیسے تم خود اس کمرے میں جہاں تم رات کو رقیہ کو ڈانٹ رہی تھیں، وہی الفاظ، وہی انداز، وہی لب و لہجہ۔ تم نے ماموں کی بھی اسی طرح نقل کی جیسے وہ دوسروں کی کیا کرتی تھیں۔"

رابعہ سوئی نہیں تھی۔ اس کے بازو پر رقیہ کا سر تھا اور رابعہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں۔ سالوں پہلے ابّا نے اسے بک بک کرنے پر جس طرح ڈانٹا تھا، بالکل اسی طرح انہی الفاظ میں اس نے رقیہ کو سمجھایا تھا۔ وہ خود اپنی آواز اور انداز پر حیران رہ گئی تھی۔ اتنے برسوں بعد بھی وہ ان لفظوں کو اسی ترتیب سے استعمال کر کے خود کو ابّا کی جگہ پر کرنے کے قابل نہیں بنا سکی تھی۔ اسے احساس تھی، وہ رقیہ کے لیے ماں باپ کی جگہ نہیں لے سکی ہے۔

ابّا نے رقیہ کی زندگی پر اس کے احساسات پر اپنے اثرات اس قدر گہرے چھوڑے تھے کہ وہ رابعہ کو باپ کی جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ جب ابّا رابعہ کی جانب سے فکر مند رہنے لگے اور مسعود لندن چلے گئے تو کچھ لوگوں نے انہیں دوسری شادی کے لیے اکسایا۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کا گھر میں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ اسی لیے رابعہ کے لیے کوئی رشتہ نہیں آتا کہ گھر میں ماں ہے نہ کوئی بزرگ عورت۔ ابّا کو رابعہ کے مستقبل کی ایسی فکر سوار تھی کہ وہ یہ بلا کھیلنے پر راضی ہو گئے اور ایک بیوہ کی ڈھلتی عمر کی بیٹی سے شادی کر کے رابعہ کو مزید امتحان میں مبتلا کر دیا۔ ماسٹر صاحب کی غربت نے نئی بیوی کو بہت جلد اکتا دیا۔ ادھر خاندان والوں کے طرزِ عمل نے انہیں باور کرایا کہ کوئی بھی ماسٹر صاحب کو اپنے برابر نہیں سمجھتا۔ ان پر اس کا بہت بُرا اثر پڑا۔ سکول کی نوکری ختم ہو گئی اور چند ٹیوشن پر ہی گھر کی دال روٹی کا دار و مدار تھا۔

تب پہلی بار اسے زندگی کے مسائل اور ان کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ خود بہت معاملہ فہم اور تجربہ کار سمجھتی تھی مگر زندگی نے جانے کتنے امتحان اس کے لیے مختص کیے ہوئے تھے۔

نئی ماں رقیہ کو جنم دے کر خود کو قابل قدر ہستی سمجھنے لگی اور رابعہ پر حکومت کرنے لگی۔ ابّا کو اس کا لہجہ پسند نہ تھا۔ وہ انہیں خاطر میں کب لاتی تھی۔ آئے دن غربت کے طعنے دے کر انہیں زخمی کرتی۔ رشتے داروں کے گریز اور پریشانیوں میں گھرے ابّا بیمار ہو گئے۔

لاکھ رابعہ انہیں تسلی دیتی، حوصلہ بڑھاتی مگر وہ دوسری شادی کر کے اس قدر پچھتا رہے تھے کہ اب انہیں کوئی جملہ کوئی دلاسا زندگی کی طرف کھینچنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ رابعہ کا مسئلہ تو کیا حل ہوتا۔ رقیہ ایک سوال بن کر ان کے احساس پر بوجھ بن گئی۔

رابعہ نے محلے والوں کی وساطت سے سکول میں نوکری کر لی۔ ابّا کے شاگردوں کو پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر لی اور کچھ سلائی بھی ملنے لگی۔ ابّا کے علاج اور گھر کی دال روٹی کا سہارا ہو گیا۔ ابّا کو رابعہ کی ملازمت سے دکھ پہنچا۔

ادھر نئی ماں کے نخرے بڑھتے گئے۔ اس کی فرمائشیں ناقابل برداشت ہو گئیں۔ رابعہ صبر و برداشت سے مشکلات کا سامنا کر رہی تھی۔ اب اس کے لیے کوئی رشتہ آتا بھی تو ماں انکار کر دیتی۔ اس کے پاس جواز موجود تھا۔ وہ گھر کو سنبھالے ہوئے تھی۔ شادی ہو جاتی تو کمائی سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ رابعہ بھی باپ بہن اور ماں کو بے آسرا چھوڑ کر شادی رچانے کے حق میں نہ تھی مگر ابّا زور دیتے کہ رابعہ کو شادی کر لینی چاہیے۔ اللہ رازق ہے، وہ ہماری مدد کرے گا۔

ایک روز ایسے ہی موقع پر رقیہ کی ماں لڑ جھگڑ کر گھر سے چلی گئی اور پھر نہیں آئی۔ ابّا مزید ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اب وہ دن میں بھی آنسوؤں سے رویا کرتے۔ پہلے رابعہ سے آنسو چھپاتے تھے، اب اس پر بھی اختیار نہ رہا۔ ابّا کے آخری ایام خنودگی میں رابعہ کو پکارتے گزرے۔ وہ کبھی کبھی مسعود کو بھی بلاتے مگر مسعود لندن سے آنے کے بعد ملازمت اور افسری کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

ابّا کے علاج کے لیے رابعہ نے ساری صلاحیت صرف کر دی۔ مکان بیچ کر ان کا بہتر سے بہتر علاج کرایا اور ایک بہت چھوٹا سا سر چھپانے کے لیے مکان ہمدرد محلے والوں کی مدد سے خرید لیا مگر موت کا کسی کے پاس علاج نہ تھا اور ڈاکٹر کہتے تھے۔ "وہ زندگی کے خواہاں نہیں ہیں، اس لیے موت سے قریب تر ہو رہے ہیں۔"

آخر کار وہ غیرت دار، محنتی، علم کا رسیا جو لوگوں میں نیکی تقسیم کرتا رہا ساری زندگی ایک ہی مقصد کے تحت گزار کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ ان کی موت پر چند عزیز آئے مگر یوں جیسے چھوت کی بیماری کا خطرہ ہو۔ صرف مسعود کی امی ہی رابعہ کے دلاسے کے لیے تین دن اس ایک کمرے کے مکان میں بغیر کسی کراہت کے رہیں اور مسعود نے تو اپنے اس چاہنے والے ماسٹر صاحب کی صورت دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی جن کے احسانات کا ذکر کرتے وہ نہ تھکتے تھے۔

رابعہ نے انہیں مطلبی، خود غرض کا خطاب دے کر دل کو سمجھا لیا۔ اب اسے مرد بن کر رہنا تھا۔ رقیہ کو پالنا تھا۔ کس طرح دن مہینے سال بیتے اور اس نے کسی کی مدد قبول کیے بغیر رقیہ کو اس قابل کر دیا کہ وہ بھی محنت میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ پھر دور کی رشتے کی خالہ کو رابعہ کا خیال آیا۔ آس پاس نیک ہمدرد لوگ تھے۔

مگر جوان لڑکی کی شادی کے لئے سب نے مشورہ کر کے خالہ کو اختیار دے دیا۔

وہ دن بھی رابعہ کی زندگی میں آنا تھا اس کی خوشامدیں، دھمکیاں کچھ کام نہ آئیں اور خالہ نے اپنے کسی عزیز سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ وہ اس روز بہت روئی مگر اب اسے زندگی بھر رونا تھا یا اسے یقین تھا اس کی قسمت میں کوئی خوشی بھی آئے گی یہ توقع اسے نہ تھی۔

سسرال جا کر بھی شوہر والی نہ بن سکی دولہا تو ایسا غائب ہوا جیسے اس کا وجود ہی نہ تھا۔ چار دن انتظار کر کے ساس اسے واپس گھر پہنچا گئی جہاں خالہ صغریٰ رقیہ کے ساتھ مطمئن تھیں کہ بھانجی کو گھربار کا کر دیا۔ رابعہ کو اب کسی بات سے خوف نہ آتا، نہ دولت محسوس ہوتی، نہ غم ہوتا۔ اس نے اتنے غم سہے تھے کہ ہر صدمہ قبول کرنے کو تیار رہتی۔ اپنی ذات کی بھی اسے پرواہ نہ رہی تھی پہلی بار ہی لڑکی ہو کر محبت کا اظہار کر کے جو غلطی کر چکی تھی اس نے خود اسے اپنی نظروں میں ذلیل کر دیا تھا۔ مسعود کی معذرت نے اسے مزید پستی میں گرا دیا تھا اسے ہر طرف طعنوں اور نظروں کے سائے نظر آتے تھے۔ رقیہ کی تربیت الگ ایک امتحان تھا۔

شادی کے ایک ہفتے بعد طلاق بھی آ گئی۔ اب وہ تھی اور رقیہ کا کمزور سہارا۔ سہارا صغریٰ خالہ نے بھی دینا چاہا مگر اب وہ مزید کسی تجربے کے لئے تیار نہ تھی۔

رقیہ بڑی ہو رہی تھی اور اس کے سکول کے خرچ بھی بڑھ رہے تھے۔ رابعہ اسے بہت حوصلے کے ساتھ پڑھا رہی تھی مگر اچھے سکول میں ہر روز کوئی نہ کوئی خرچ کا جواز نکلتا اور رقیہ کھیل میں اچھی پوزیشن لیتی تھی اس کے لئے اسے بہت ٹھیک ٹھاک رہنا پڑتا تھا۔

(جاری ہے)

سائبان

آسیہ رزّاقی

آخری قسط

چند دن سے وہ نئی یونیفارم اور ٹینس شوز کے لئے ضد کر رہی تھی۔ رابعہ اس کی تگ و دو میں لگی ہوئی تھی کہ اخبار میں اس نے اشتہار دیکھا۔ اشتہار سعود کی جانب سے دیا گیا تھا۔ انہیں ایک جوان اور تعلیم یافتہ آیا کی ضرورت تھی۔ وہ سوچتی رہی کہ جاؤں کہ نہ جاؤں۔ پتہ نہیں اس کی بیوی کس مزاج کی ہوگی۔ امیر لوگوں کے چونچلے بھی خوب ہوتے ہیں۔ کیا وہ ایک بچہ بھی نہیں پال سکتی۔ کہیں اسے دیکھ کر سعود کہہ نہ دے کہ آخر کار غرض مند ہو کر آ ہی گئیں مگر وہ برابری کا سودا کرنے جائے گی۔

یہ سوچ کر وہ رفیعہ کو تیار ہونے کا کہہ کر خود بھی تیاری کرنے لگی۔ اسے یقین نہ تھا کہ یہ ملازمت اسے مل جائے گی۔ سعود کو اعتراض ہوگا۔ پھوپھی اماں بھی اُسے آیا کے روپ میں شاید پسند نہ کریں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ برسوں بعد ان کے شاندار گھر میں داخل ہوئی تو پھوپھی اماں نے پُر تپاک خیر مقدم کیا تھا۔ اس نے اوّل اوّل ان کی خیریت دریافت کرنے کا بہانہ بنایا پھر ان کے ”گزر اوقات کیسے ہوتی ہے“ کے سوال پر مدعا زبان پر لائی۔

اتفاق سے سعود بھی گھر آ گئے۔ ان سے ملاقات بھی واجبی رہی۔ وہ ابھی تک ان کی بیوی سے نہیں ملی تھی۔ اسے سعود میں بہت فرق محسوس ہوا تھا۔ وہ بہت نکھرے نکھرے، غیر غیر سے لگے۔ نہ مخاطب ہوئے نہ کچھ پوچھا۔ ارے اپنے ماموں کی تعریف کے دو الفاظ ہی کہہ دیتے۔

دن گزر گیا اور پھوپھی اماں نے سعود سے ذکر تک نہیں کیا۔ جانے ان کی بیوی کس حجرے میں تھیں کہ اس نے ان کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ بچہ ڈیڑھ سال کا تھا پھوپھی اماں نے بتایا سعود شادی پر راضی ہی نہیں تھے، زبردستی شادی کی گئی۔ تین سال پہلے اُف...... سعود نے اتنی لیٹ شادی کیوں کی؟ ان کو امیر زادیوں کی کمی تو نہ ہوگی۔ پھوپھی اماں نے بارش کا بہانہ کر کے رابعہ کو روک لیا حالانکہ نہ وہ نمک کی بنی ہوئی تھیں نہ امیر زادیاں تھیں وہ تو ایک محنت کش باپ کی بیٹیاں تھیں۔

رات کو پھوپھی اماں نے دبی دبی زبان سے بتایا۔ ”سعود کی بیوی سے بنی نہیں وہ چلی گئی ہے۔“

ارے ایسا شاندار گھر، یہ خوبصورت شوہر اور پیارا پیارا بچہ۔ نیند نہ آنے سے اسے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ خیالات کا ہجوم تھا۔ کمرے میں حبس معلوم ہو رہا تھی۔ چلکے سے کانپ کر اس نے کھڑکی بند کر دی۔ اس کی زندگی بھی اس رات جیسی تاریک تھی۔ بے حرارت تاریک اور سرد۔

مگر اس رات کی صبح روشنی اور امید کی کرنوں کے ساتھ طلوع ہوگی جبکہ رابعہ کی زندگی امید اور صبح سے خالی تھی کوئی ہلچل نہیں تھی۔ لمبا سانس لے کر وہ پلٹ آئی۔ پھوپھی اماں کے کمرے سے احد کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

”پھوپھی اماں سو رہی ہوں گی اور احد شاید بھوکا ہے۔ شکورہ بھی گہری نیند میں ہوگی۔ بے چارہ بچہ...... پتہ نہیں اس کی اماں اسے چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ سعود کی اس سے کیوں نہ بنی؟“

سعود کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں، اسے یقین نہ تھا مگر عورت اپنے بچے کو بہت مجبوری کی حالت میں چھوڑتی ہے۔ اسے مفاہمت کر لینی چاہیے تھی۔ یہ امیر لوگ شاید ہر کام بغیر سوچے سمجھے کر بیٹھتے ہیں مگر بچے کا تو سوچا ہوتا، بہت غیر محفوظ ہوتا ہے بچہ ماں کے بغیر۔ اس کی شخصیت ہی بگڑ جاتی ہے۔ اس نے رفیعہ کو بے حد محنت اور دلداری سے پرورش کیا تھا۔ کوشش کی تھی کہ اسے ماں کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہو مگر وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہوئی۔ ماں کی شفقت بھری گود کا رفیعہ کو خوب اندازہ تھا۔ وہ سمجھدار تھی۔ جب ماں سے بچپن ہی محروم ہوئی۔

اب یہ بچہ...... اس کا بلک بلک کر رونا اس کے اعصاب کو تھکا رہا تھا۔ ماں ہوتی تو وہ اتنی دیر تک کیوں روتا۔ وہ سینے سے لپٹا لیتی، بہلا لیتی اس کی تکلیف کا ازالہ نہ کرتی کیا؟

احد برابر رو رہا تھا۔ ہمت کر کے اس نے گیلری کا دروازہ کھولا۔ تیزی سے پھوپھو اماں کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس کا دروازہ بند نہ تھا۔ احد پلنگ پر اکیلا لیٹا تھا۔ وہ خوب چیخیں مار رہا تھا مگر شکورہ اماں بے خبر سو رہی تھی۔ پھوپھی اماں کمرے میں نہ تھیں۔ وہ بچے کی جانب بڑھی تب ہی کمرے کے اندرونی درمیان کا دروازہ کھلا اور سعود نے کمرے میں قدم رکھے۔ وہ بھی احد کی طرف لپکے تھے مگر انہیں فوراً اندازہ ہو گیا کمرے میں امی نہیں ہیں اور رابعہ نے احد کو اپنی گود میں اٹھا لیا ہے۔ اسے بہلا رہی ہے۔ بستر درست کر رہی ہے اور اب وہ پُرسکون ہو کر رابعہ کی انگلی سے کھیل رہا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے سعود کی انگلی سے کھیلا کرتا تھا۔

انہیں اچانک بے حد تھکن محسوس ہونے لگی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ نیند نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

صبح بہت سویرے رابعہ نے جب پھوپھی اماں سے واپسی کی اجازت طلب کی تو وہ چپ ہو گئیں۔ اس کے مایوس اور فکر مند چہرے پر لکھی درد کی تحریر پڑھنا کس قدر آسان تھا۔ ان کا دل دکھ گیا۔ وہ تو رات کو نماز سے فارغ ہو کر دیر تک وظیفے پڑھا کرتی تھیں مگر آج خنکی کی وجہ سے زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکیں۔ بستر پر لیٹ گئیں لیکن خیالات کے ہجوم نے انہیں زیادہ دیر تک سونے نہیں دیا۔ رابعہ کی حسرت ناک زندگی، رفیعہ کا مخدوش مستقبل، احد کی پرورش، وہ سب کے ساتھ انصاف کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی زندگی بھی اب چراغِ سحری تھی اور وہ اپنی زندگی میں سب کو مناسب اور معقول جگہ پر دیکھنے کی متمنی تھیں۔ انہیں رابعہ سے بے حد ہمدردی تھی۔

اگر ان کے شوہر حیدر بھائی کی غربت کو وقار کا مسئلہ نہ بنا لیتے تو آج وہ ان کے گھر کی بہو ہوتی۔ اب بھی وقت گزر رہا نہیں۔ سعود نے کس قدر رقتوں کے بعد شادی کی حامی بھری تھی۔ وہ تو مایوس ہو چکی تھیں مگر ان ہی کی تمنا کی خاطر سعود نے شادی کی اور انہیں پوتے کی صورت بھی دکھا دی۔

وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگیں۔ وہ بجے رات کو انہوں نے بیچ کا کمرہ کھول کر جھانکا تھا۔ سعود خلاف معمول جاگ رہے تھے اور ٹہل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اضطراب کی کیفیت تھی اور وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگیں۔

”ہائے میرا بچہ! والدین کی خواہش پر قربان ہو گیا۔ کس قدر دل گرفتہ ہے۔ مایوس اور محروم محبت، ہر نعمت میسر ہے مگر زندگی سے بے زار۔ اکتایا ہوا رہتا ہے۔ سفینہ نے ذرا سی عقل سے کام لیا ہوتا تو سعود کی حالت یہ نہ ہوتی۔ وہ لندن سے آنے کے بعد بھی باپ سے ناراض تھے مگر عہد کر چکے تھے اس لئے رابعہ سے ملنے نہیں گئے انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ کوئی زندہ آدمی ہے۔ بس ایک بار جب ان کی شادی طے ہو گئی، انہوں نے ماں کے کندھے پر سر رکھ کر التجا کی تھی۔

”امی! اب بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ خدارا کچھ کیجئے۔ میں ضمیر کی عدالت میں کب تک مجرم بنا رہوں گا اور کتنی سزا بھگتوں گا۔“

مگر وہ مجبور تھیں۔ رابعہ کا لفظ بھی منہ سے نہ نکالا کہ کہیں چنگاری میں کوئی حرارت پہنچنے سے شعلہ نہ بن جائے۔ ابھی کچھ دن پہلے وہ سعود کی الماری صاف کر رہی تھیں۔ ان کے کالج کے زمانے کے کتنے ہی کاغذ، کاپیاں اور ردی انہوں نے پھینک دی تھی۔ تب ہی سعود نے آ کر کاغذات کے انبار دیکھے اور ان میں سے تلاش کر کے پرانی سی ایک کاپی نکالی۔ اسے جھاڑا اور اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔

”میں نے سب دیکھ بھال کر پھینکا ہے۔ یہ پرانی کاپی ہے اس میں کچھ نہیں ہے۔“

”امی! یہ تو میرا سرمایہ حیات ہے۔“ انہوں نے سرد آہ بھر کر شعر پڑھا۔

اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں ہیں
اس میں ماضی ہے میرا اور عہدِ شباب

اگلے دن انہوں نے سارا کمرہ ازسر نو ٹیپ کر کے گدے کے نیچے سے کاپی نکال لی۔

تب انہیں اندازہ ہوا جس چنگاری کو وہ بجھا ہوا سمجھ رہی تھیں۔ اس میں آج بھی وہی حرارت ہے۔ اوّل دن سے سلگ رہی ہے۔ یہ کاپی ان کے لڑکپن کے واقعات سے بھری ہوئی تھی۔

”رابعہ...... رابعہ...... ماموں...... فلسفۂ زندگی، فلسفۂ محبت، ماموں نے زندگی کی تشریح کی۔ رابعہ نے چائے میں کون سی پتی ڈالی تھی۔ وہ شفق ہے تو روشنی ہی ہو جاتی ہے۔ مجھے اس کی ہنسی پسند ہے اور اس کی خفگی بھی۔ آج نہیں مناؤں گا۔ کل تک بھول جائے گی۔ آج اس نے مزیدار لطیفہ سنایا۔“

بس ایسی ہی معصوم باتوں سے کاپی بھری ہوئی تھی۔ نہ محبت بھرے شعر تھے، نہ رابعہ کی تعریف میں صفحے سیاہ ہوئے تھے۔ تعریف تھی تو ماموں کی۔ ان کی شخصیت پر شاندار الفاظ میں قصیدے تھے۔ ان کی محبت، خلوص، بے غرضی، ایثار و قربانی کا اعتراف تھا۔ وہ کاپی لے کر شوہر کے پاس گئیں۔ انہیں چند صفحے پڑھوا کر آب دیدہ ہو گئیں۔

”سنئے آپ نے میرے بیٹے پر بہت ظلم کیا ہے۔ اس کا دل توڑا ہے۔ اسے اپنے مفاد کی خاطر قربان کر دیا۔ اس کے دل میں بچپن کی محبت کی جڑیں بہت مضبوط ہیں خدارا اس کے لئے کچھ کریں۔“

سفینہ جا چکی تھی اور رابعہ ان کی پہنچ سے دور تھی۔ وہ اپنی غلطی پر پشیمان تو تھے لیکن اعتراف کرنا انہیں آتا نہ تھا۔ کچھ دن کے بعد جب انہیں علم ہوا رابعہ کی شادی ڈھکوسلہ تھی تو انہیں ہمت نہ ہوئی کس طرح اس سے جا کر کہیں۔

”رابعہ میرا بیٹا تم سے محبت کرتا ہے تمہارے سوا کوئی اس کو خوشی نہیں دے سکتا۔“

وہ رابعہ سے کچھ کہتے ہوئے جھینپ رہے تھے۔ بڑے پن نے عمل کی اجازت نہیں دی۔ وہ خود سعود کو رابعہ سے شادی کرنے سے روک چکے تھے۔ اب کس منہ سے اس کے سامنے جائیں۔ بیوی کو ٹال دیا، وہ بھی چپ ہو گئیں مگر اب جو رابعہ آیا کے لئے اشتہار پڑھ کر آئی تھی اور مصر تھی کہ اسے یہ ملازمت ضرور دے دی جائے تو انہوں نے وعدہ تو کر لیا تھا مگر سعود سے کس طرح کہیں۔ وہ یقیناً ان پر ناراض ہوگا۔ وہ سعود کو کمرے میں ٹہلتا دیکھ کر خفیف ہو کر میں باہر نکل کر میاں کے پاس گئی تھیں۔ انہیں دکھیاری فرزدہ بھتیجیوں کے لئے بھی کچھ کرنا تھا اور بیٹے کی خوشیوں کو واپس لانے کی کوشش بھی۔

میاں کے سامنے بیٹے کے لئے جھولی پھیلا دی اور صبح تک بحث مباحثے کے بعد اپنا موقف منوانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اذان کے ساتھ ہی نوید مسرت ملی۔ سبک خرامی سے اپنے کمرے میں داخل ہوئیں تو پلنگ پر رابعہ احد سے لپٹی لیٹی سو چکی تھی۔ انہوں نے اسے نیک شگون سمجھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور نماز کی تیاری کرنے لگیں۔

صبح جب رابعہ نے واپسی کی اجازت چاہی تو اس کے چہرے پر لکھی درد کی تحریر نے انہیں متاثر کیا وہ بولیں۔

”بیٹی! ابھی میں نے سعود سے ذکر نہیں کیا۔ ناشتے کے وقت آئیں گے تو کہوں گی۔ ذرا صبر کرو۔“

”صبر“ اس نے سوچا ”صبر ہی تو کرتی رہی ہوں۔“

مگر ناشتے کے وقت مسرور آ گئے اور آتے ہی اپنے میچ اور ٹیم کی فتح کی خوشخبری سنائی۔ ماں باپ ان کے خیر مقدم میں ان کی فتح کی خوشی میں لگے ہوئے تھے۔ دعائیں، امیدیں، تمنائیں بار یاب ہوئی تھیں۔ رابعہ ان کو مسرت سے بے قابو ہوتے دیکھ کر سوچ میں گم تھی۔ وہ اپنی داستان سناتے سناتے رفیعہ کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”یہ...... اس لڑکی کو تو میں پہچانتا ہوں۔“

رفیعہ مسکرا دی۔ کچھ کہنے کو ہونٹ کھولے تھے پھر بہن کی نصیحت یاد آ گئی۔ سختی سے منہ بند کر لیا۔ سعود کو بھی رات کی بات یاد آ گئی۔ رفیعہ کا منہ کھول کر پھر بند کر لینا وہ سمجھ گئے بہن کی خفگی فراموش نہیں ہوئی۔ انہوں نے مسکرا کر پیالی منہ سے لگالی۔

”بیٹا! یہ تو رفیعہ ہے میری بھتیجی، تمہاری کزن“ امی نے بیٹے کو بتایا۔

”ہائیں؟ یہ میری کزن ہے اور میں آج پہلی بار اس گھر میں اس سے مل رہا ہوں۔ کمال ہے کھیل کے میدان میں تو ابا جی! اسے دیکھ کر سوچا کرتا تھا۔ کاش اس پائے کی کھلاڑی میری بہن ہوتی ”کزن ہوتی“ کوئی واقف کار ہی ہوتی۔ امی! یہ بہت سے میڈل لے چکی ہے۔ آپ کو بتایا ہوگا اس نے۔“

”نہیں بتایا تو نہیں۔ کیا تم اس کے ساتھ کھیلتے ہو۔“ انہوں نے تعجب سے کہا۔

”ارے نہیں امی!“ مسرور کو بھی بلاتکان بولنے کا مرض تھا۔ ”دراصل ہمارے کالج گراؤنڈ میں ان کے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔ کئی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ ہم تو دور سے ان کا کھیل دیکھا کرتے ہیں۔ کیا نام......؟“ انہوں نے رفیعہ کی سمت دیکھا۔

”رفیعہ حیدر“ رفیعہ نے متانت سے بتایا۔ واقعی تعریف سن کر جھینپ سی گئی۔

”ہاں رفیعہ! یاد ہے میں نے ایک بار تم سے آٹو گراف بھی مانگا تھا۔ میرے پاس محفوظ رکھا ہے۔ بھئی مستقبل کی مشہور کھلاڑی کا آٹو گراف بھی قیمتی ہوتا ہے۔“ اس نے ماں باپ کو مخاطب کیا۔

”اور جناب! مجھے آٹو گراف دے کر انہوں نے اپنی ہتھیلی آگے کر دی۔ میں نے بھی بلاتکلف پین کی نب زور سے گڑ کر اپنے دستخط کر دیئے۔ ہتھیلی تو دھل کر صاف ہو گئی“ نب کی چبھن البتہ کچھ دیر تک رہی ہوگی۔“

رفیعہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ بولنے کو بیقرار تھی مگر فرمانبرداری نے زبان پر مہر لگا رکھی تھی۔

”ہاکی میں فل بیک کی پوزیشن پر کھیلتی ہیں یہ صاحبہ؟“ انہوں نے بغیر کسی کے پوچھے اس کا تعارف جاری رکھا۔ ”اور کرکٹ میں آل راؤنڈر ہیں۔ میری طرح“ بالکل میری طرح۔ میں بھی فل بیک ہوں“ اس لئے دوسرے فل بیک کا کھیل بغور دیکھا کرتا ہوں تاکہ اپنی اصلاح کر سکوں اور جناب! دوڑ میں بھی انہیں کئی گولڈ میڈل ملے ہیں“ بالکل میری طرح کیوں امی! وہ میرے میڈل اور کپ کہاں ہیں؟ میں کیا نام......؟“ وہ پھر رفیعہ سے مخاطب ہوئے۔

”رفیعہ حیدر“ اب رفیعہ کو مسکراہٹ دبانا مشکل ہو گئی۔

”ہاں...... سوری...... رفیعہ حیدر کو سارے انعام دکھاؤں گا۔ ذرا ناشتے سے دو دو ہاتھ کر لوں“ کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔ یعنی گھریلو ناپ ناشتے کا ترسا ہوا ہوں۔“

رفیعہ کی مسکراہٹ اب ہونٹوں کی حدود سے نکل کر چہرے پر پھیل گئی تھی۔

”سعود! رابعہ اب گھر جانے کا کہہ رہی ہے۔“ سعود کے کمرے میں جا کر امی نے انہیں مطلع کیا۔

”تم نے شاید اخبار میں احد کے لئے آیا کا اشتہار دیا تھا وہی پڑھ کر آئی ہے۔ بہت تکلیف میں ہے اس لئے مستقل آمدنی والی ملازمت کی ضرورت ہے۔ بہن کی تعلیم کے لئے فکر مند ہے۔ کہہ رہی ہے سرونٹ کوارٹر میں رہ لیگی اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ بیٹا! تم کو تو احد کے لئے نیک شریف آیا کی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت مند بھی ہے کہہ رہی تھی بزرگوں کے سایے میں حفاظت کا احساس ہوگا۔ رفیعہ کو بھی اب کسی نگرانی اور پابندی کی ضرورت ہے“ وہ بے چاری لاچار ہو گئی ہے اس لئے اس گھر میں امید لے کر آئی“ پہلے کب یہاں سے اسے کچھ ملا ہے۔“

سعود بہت ضبط سے ماں کی باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے ان کے کندھے پکڑ کر سختی سے کہا

”امی...... امی...... کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ رابعہ کو آیا بنا دوں۔ ماموں کے احسانات کا یہ صلہ۔ انہوں نے مجھے آدمی سے انسان بنایا۔ مجھے اپنی محبت و شفقت کے سایے میں رکھا۔ میں تہی دست تھا۔ مجھے علم کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ زندگی گزارنے کے ڈھنگ سکھائے۔ میں ان کے احسانات اپنی پوری زندگی کی دولت لٹا کر بھی ادا نہ کر سکوں گا۔ ان کی بیٹی کو کچھ نہ دے سکا تو اب آیا بنا دوں۔ کچھ سوچئے امی!“

ان کی آواز بھاری ہو گئی۔ مڑ کر دو قدم پیچھے کو چلے گئے پھر واپس آ کر ماں سے مخاطب ہوئے۔

”ماموں نے مجھ سے کتنی محبت کی تھی۔ مجھ سے کیا کیا امیدیں باندھی تھیں۔ میں آج بھی اتنا ہی تہی دست ہوں، جتنا بچپن میں تھا جب گلے میں بستہ لٹکا کر پیدل ان کے گھر جایا کرتا تھا میرے پاس اس وقت سائیکل تک نہ تھی۔ ابا کے پاس کوئی چھوٹی موٹی سواری نہیں تھی اور ماموں کے پاس دولت کے انبار اس وقت بھی تھے جو وہ ہر ضرورت مند پر دونوں ہاتھوں سے لٹایا کرتے تھے۔ امی! یاد ہے، میں کلاس میں کمزور تھا اور ماموں کی محنت نے مجھے ایک سال میں کیا سے کیا کر دیا تھا اور اس کے بعد بھی پورا وقت میری اعلیٰ پوزیشن کے لئے کوشش کرتے رہے تھے۔ یہ...... یہ صلہ تو نہیں ہے نا ان کی بزرگی، ان کی عظمت اور خلوص کا ان کی رابی...... میرے بیٹے کی آیا......“

سعود بے حد جذباتی ہو گئے ان پر رقت طاری ہو رہی تھی۔ غضب خدا کا، وہ ماموں کی بیٹی کو شریک زندگی نہیں بنا سکے تو آیا کیسے بنالیں۔ وہ ان کے بچوں کی ماں بننے کے لائق نہیں تو آیا بن کر ان کے بیٹے کی پرورش کرے۔ یہ کیسا انصاف ہے خدایا! رابی یہاں کیوں آئی، کس لئے اس نے مجھ پر یہ ستم توڑا، اسے شرم نہیں آئی۔ وہ مجھے ان احسان فراموش لوگوں میں شمار کر لیتی جو اس کے گھر محض اپنے فائدے کے لئے جاتے تھے۔ اپنی غرض سے ماسٹر صاحب کے گھر کا راستہ ناپا کرتے تھے مگر مجھے بے غیرت اور بے حمیت سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے اس نے۔

”تو پھر؟“ امی نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا۔ ”تم اس سے سودا کر لو، اسے ایک سائبان چاہئے اور تمہیں احد کے لئے ماں۔ برابری کا سودا ہے، سوچ لو۔ پہلے نہیں ہوا تو اب ہو سکتا ہے۔“

سعود کا سانس رکنے لگا۔ الفاظ آگ کے شعلے بن کر ان کے سینے کو جلانے لگے۔ آگ دل میں سلگ رہی تھی آنکھوں میں جل رہی تھی اور گلا بھی دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئے اور میز پر رکھے پانی کے گلاس کی جانب ہاتھ بڑھا دیئے۔

”تمہارے ابا کی بھی یہی رائے ہے“ امی نے ایک اور دھماکا کیا ”حیدر بھائی کے احسان کا بدلہ ہم نہیں دے سکتے مگر عاقبت میں سرخ رو ہو سکتے ہیں۔ حیدر بھائی کی روح سکون پائے گی۔ ان کی بیٹیوں کو گھر ملے گا اور ایک چھت ملے گی۔“

انہوں نے بمشکل پانی کے گھونٹ حلق سے اتارے۔ ”اب یہ مشکل ہے امی! میرے پاس تو کچھ باقی نہیں بچا۔ میں تو ایک ٹوٹا پھوٹا سائبان ہوں، کسی کو کیا دے سکتا ہوں یہ تو دھوکا ہوگا ماموں کی روح کے ساتھ۔ انہیں زمانے نے، وقت نے اور آپ لوگوں نے مجھ سے جینے کا حق چھین لیا۔ میرا اعتماد لوٹ لیا۔ پھر باقی کیا بچا۔“ وہ بہت تھکے ہوئے مسافر کی طرح بستر پر لیٹ گئے۔

امی بگڑ گئیں۔ ”تم سلامت ہو، ہاتھ پیر سلامت ہیں اور دل بھی تمہارا موجود ہے۔ بے کار میں ڈرامہ نہ بناؤ۔ تمہیں ایک گھر والی کی، احد کو ماں کی اور مجھے ایک مددگار کی ضرورت ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے آ گئی ہے۔ خود کو سنبھالو اور حالات کا مقابلہ کرو۔ دیر سے سہی مگر بہت مناسب فیصلہ ہے ہمارا۔ شام کو جواب لینے آؤں گی۔“

سعود ان کو دیکھتے رہے، وہ باہر چلی گئیں، بڑبڑاتی ہوئی۔ باہر سے رفیعہ اور مسرور کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں کتنے معصوم اور سادہ ہیں دونوں۔ انہوں نے سوچا، شام کو نرم نرم دھوپ کی حرارت میں لان کے کونے میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے، تب ہی ابا بھی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ مسرور ان کے پاس سے گزرے۔ وہ لان میں دوڑ لگا رہے تھے۔

”دیکھو مسرور! کیاری میں جو پھول لگے ہیں ان کو نہ کچل دینا۔“ امی نے برآمدے سے ہی آواز لگائی۔ وہ رابعہ کے ساتھ مل کر کپڑوں کی درستی کر رہی تھی۔ رفیعہ احد کے ساتھ سیر کرنے گئی ہوئی تھی۔

”مجھے بھی نظر آ رہے ہیں پھول۔“ مسرور نے کہا۔

”تو وہاں پھلانگیں مت لگاؤ۔ بڑی محنت سے لگے ہیں یہ پھول تم کو کیا احساس۔“

سعود نے دل میں سوچا، پھول مرجھا جاتے ہیں پھر ان کو کوئی طاقت تازگی عطا نہیں کر سکتی میرا دل بھی مردہ ہو گیا ہے۔ مسرور ان کے قریب ہی ورزش کرنے لگے پھر رک کر بولے

”بھائی جان! کیا خیال ہے، ہم دونوں کے مسئلے حل ہو گئے اس خوشی کے موقع پر پارٹی دی جائے۔“

”کون سے مسئلے؟“ سعود نے بے خیالی میں پوچھا۔

”ارے آپ کی رابعہ آپا سے شادی اور میری رفیعہ سے منگنی۔“

سعود نے گھبرا کر ابا کی طرف دیکھا، پھر مسرور کو گھورا۔ ابا نے اخبار اٹھا لیا اور اس میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

”کیا آپ کو انکار ہے رابعہ آپا سے شادی پر؟“ مسرور حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

”مگر تم...... تم......“

”میری اپنی خواہش یہی ہے کہ کسی اپنے جیسی ہونہار کھلاڑی لڑکی سے شادی کروں۔ بس اب یہ معاملہ زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ بھئی ہم تو اسپورٹس مین ہیں۔ بے دھڑک خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور ہمیشہ فتح کی امید لے کر میدان میں اترتے ہیں اور مخالف ٹیم کے چھکے چھڑا دیتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، رفیعہ میرے لئے مناسب ہے نا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ سعود والد کی موجودگی سے گھبرا رہے تھے۔ ”کیا اوٹ پٹانگ لگا رکھا ہے۔“

”کیوں نہیں کہہ سکتے۔“ مسرور نے اصرار کیا۔ ”دیکھئے بچے ہیں آپ اور پھر دو عزیز بھی تو ہے ہماری۔“

”ابا...... ابا جان سے اجازت......“

”ارے بھائی جان! ابا جان کی شادی کی بات تو نہیں کر رہا میں، ان کے لئے تو امی جان ہی بہت ہیں۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔ میری شادی میری زندگی کا سب سے اہم میچ ہوگا۔ اس میں تو میں فتح کے شادیانے بجانا چاہتا ہوں۔ ہاں ابا جان کو چیک کر سکتے ہیں اور آپ کو میں نے ریفری بنا دیا ہے۔ چلئے فیصلہ کیجئے۔“

(باقی صفحہ 52 پر)

بقیہ سائباں

سرور بے حد آزادی سے بول رہے تھے اور سعود کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اس لڑکے کو کسی مخالفت کی پرواہ ہے نہ کسی کا ڈر ہے۔ یہ اتنا پیارا اور اتنی اعتماد کیوں ہے۔ ابا جان خاموش ہیں۔

"ہاں اچھی ہے۔ مجھے اچھی لگی ہے" انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"زندہ باد" سرور نے نعرہ لگایا پھر ابا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "ابا جان! اب منگنی کی پارٹی کس دن رکھی جائے۔ مطلب یہ کہ بھائی جان کی شادی کے دن ہی یا اس کے بعد۔ میں اس کام میں دیر نہیں کرنا چاہتا ہوں فوراً ___ فوراً ___"

سرور چٹکی بجاتے ہوئے کہہ رہے تھے اور ابا جان سر ہلا کر منظوری دے رہے تھے۔

سعود کو گزرے ہوئے ماہ و سال کے ضائع ہونے، تباہ و برباد ہونے کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ کاش انہوں نے بھی بچپن میں ہی کرکٹ میں کوئی مثال قائم کی ہوتی۔

"بھائی جان! آپ کرکٹ کھیلتے تھے تو پوزیشن میرا مطلب ہے کون سا شعبہ تھا؟"

"میں بالر تھا فاسٹ بالر"

"اوہ ___ یعنی ایک ___ ایک ___ آپ مجھ سے بازی لے گئے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آپ بڑے بھی تو ہیں۔ چلئے اٹھئے ذرا ابھی باؤلنگ کر کے دکھائیں۔"

بھونچکا ہو کر سعود نے ان کو دیکھا۔ پھر ابا جان کی سمت نظر ڈالی۔ وہ اخبار سمیٹ کر اندر جا رہے تھے۔

"اٹھئے نا کل تو وہ بیوی بن کر آپ پر ہم پر حکومت کرنے لگیں گی۔ آج ہی موقع ہے ذرا چھیڑ چھاڑ کر لی جائے۔ آپ باؤلنگ کریں اور میں کیچ اور سٹپ کروں۔ مزا آئے گا اب آپ اتنے سنجیدہ مت رہا کریں۔ گھر میں ہی کچھ پارٹی کیا کریں گے اف ___ کتنا اچھا لگے گا۔ آہ ___"

وہ اداکاری کرتے ہوئے راہداری کے پاس چلے گئے اور وہاں سے ان کی آوازیں، قہقہے دالان میں بیٹھے سعود کے کانوں میں رس گھولتے رہے۔ شام اتر رہی تھی اور ابا کو جواب دینے کے لئے ان کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ سرور ان کو جواب دے رہے تھے۔ ذرا شام ڈھل جانے خوشی کی رات آنے ہی والی تھی۔ حسرتوں کا سورج ڈھل گیا اور کامرانیوں کی ساعتیں زندگی میں کھل اٹھی تھیں۔

(ختم شد)